فہرستِ مضامین

بصائر و عبر

عشقِ حقیقی کا روح پرور منظر!	۳	محمد اعجاز مصطفیٰ

مقالات و مضامین

عصمتِ انبیاءؑ وحرمتِ صحابہؓ	۹	محدث العصر علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ
مسجد اقصیٰ کی تولیت اور عمار خان ناصر کی تحریرات (تیسری قسط)	۲۵	مولانا سمیع اللہ سعدی
تصوف! قرآن وسنت کی روشنی میں (دوسری اور آخری قسط)	۳۶	ڈاکٹر بشیر احمد رِند
ٹی وی کے ذریعہ تبلیغ اسلام	۴۲	مفتی عارف محمود

یادِ رفتگان

مولانا عبداللہ ندیم فاروقیؒ کی شہادت	۵۹	محمد اعجاز مصطفیٰ

دار الافتاء

زکوٰۃ فنڈ کو کاروبار میں لگانا	۶۱	ادارہ

نقد و نظر

	۶۲	ادارہ

عشق حقیقی کا روح پَرور منظر!

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللّٰہ وسلام علٰی عبادہٖ الذین اصطفٰی

حج اسلام کے ارکانِ خمسہ میں سے پانچواں رکن ہے، جس کی فرضیت قرآن کریم اور سنت نبویہؐ سے ثابت ہے۔ حج صاحبِ استطاعت مسلمان، عاقل، بالغ، آزاد مرد وعورت پر زندگی میں ایک مرتبہ فرض ہے۔ جس پر حج فرض ہو جائے، اُسے اس کی ادائیگی میں جلدی کرنا چاہیے، بلاعذر تاخیر کرنا یا ہر سال اُسے ٹالتے رہنا بہت بڑی خیر سے محرومی کا باعث ہے، اس لیے کہ نہ معلوم اُسے کوئی ایسا عذر پیش آجائے کہ جس کی وجہ سے وہ زندگی بھر حج پر نہ جا سکے، یا کوئی ایسی ضرورت پیش آجائے کہ یہ جمع شدہ سرمایہ سارا اس میں لگ جائے، جیسا کہ ایک حدیث میں ہے:

”قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: مامن عبد ولاأمة یضن بنفقة ینفقها فیما یرضی اللّٰہ إلا أنفق أضعافها فیما یسخط اللّٰہ وما من عبد یدع الحج لحاجةٍ من حوائج الدنیا إلا رأی المخلفین قبل أن تقضی تلک الحاجة یعنی حجة الإسلام وما من عبد یدع المشی فی حاجة أخیه المسلم قُضِیَتْ أو لَمْ تُقْضَ إلا ابتلی بمعونة من یأثم علیه ولا یؤجر فیه“۔ (الترغیب والترہیب، ج:۲،ص:۱۶۹)

ترجمہ:”حضور اقدس ﷺ سے نقل کیا گیا کہ جو کوئی بھی مرد یا عورت کسی ایسے خرچ میں بخل کرے جو اللہ کی رضا کا سبب ہو تو وہ اس سے بہت زیادہ ایسی جگہ خرچ کرے گا جو اللہ کی ناراضی کا سبب ہو اور جو شخص کسی دنیوی غرض سے حج کو جانا ملتوی کرے گا، وہ اپنی اس غرض کے پورا ہونے سے پہلے دیکھ لے گا کہ لوگ حج سے فارغ ہو کر آگئے۔ اور جو شخص کسی مسلمان کی مدد میں پاؤں ہلانے سے گریز کرے گا، اس کو کسی

گناہ کی اعانت میں مبتلا ہونا پڑے گا، جس میں کچھ بھی ثواب نہ ہو‘‘۔

یہ حدیث سند کے اعتبار سے اگر چہ کمزور ہے، لیکن ایسے امور میں ضعیف روایت ذکر کی جاتی ہے۔ اور تجربہ سے بھی یہ بات ثابت ہے کہ جو لوگ نیکی کے کاموں میں خرچ کرنے سے کتراتے ہیں، اکثر ان کا مال ایسی جگہوں پر خرچ ہو جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا سبب ہوتی ہیں، اس لیے حج فرض ہونے کے بعد اس میں تاخیر نہ کریں۔

اب یہ کہ حج کرنے پر کیا انعامات ملتے ہیں، اس پر آپ ﷺ نے اپنے ارشادات میں کئی انعامات گنوائے ہیں، مثلاً: جس نے اللہ تعالیٰ کے لیے حج کیا، اس میں کوئی دنیوی غرض، شہرت، ریا، نمود ونمائش، وغیرہ کو شامل نہ کیا اور اپنے حج کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے محفوظ رکھا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ اکرام کا معاملہ کیا تو وہ گناہوں سے ایسا پاک اور صاف ہوگیا جس طرح کہ نومولود بچہ گناہوں کی کثافت اور میل کچیل سے صاف ہوتا ہے۔ اور نیکیوں والے حج کا بدلہ تو اللہ تعالیٰ نے بنایا ہی صرف جنت ہے۔ نیکیوں والے حج سے مراد یہ ہے کہ سفرِ حج میں لوگوں کو کھانا کھلائے، ان سے نرم گفتگو کرے اور لوگوں کو کثرت سے سلام کرے۔ جب کوئی ان صفات اور اعمال سے حج کرے گا تو ایسا حج ان سب کوتاہیوں اور قصوروں کا خاتمہ کر دیتا ہے، جو حج سے پہلے کیے ہوں۔ حج کرنے والا جب ’’**لبیک اللّٰھم لبیک، لبیک لاشریک لک لبیک، إن الحمد والنعمۃ لک والملک لاشریک لک** ‘‘ کی صدا لگاتا اور یہ تلبیہ پڑھتا ہے تو اس کے ساتھ اس کے دائیں اور بائیں جو درخت، پتھر اور ڈھیلے وغیرہ ہوتے ہیں، وہ بھی لبیک کہتے ہیں اور اسی طرح یہ سلسلہ اس کی دائیں، بائیں کی زمین کی انتہا تک چلتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے:

’’**وعن زاذان رضی اللّٰہ عنہ قال: مرض ابن عباسؓ مرضًا شدیدًا فدعا ولدہٗ فجمعھم، فقال: سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول: من حج من مکۃ ماشیًا حتّٰی یرجع إلٰی مکۃ کتب اللّٰہ لہٗ بکل خطوۃ سبعمائۃ حسنۃ، کل حسنۃ مثل حسنات الحرم، قیل لہٗ: وماحسنات الحرم؟ قال: بکل حسنۃ مائۃ ألف حسنۃ**‘‘۔ (الترغیب والترہیب، ج:۲،ص:۱۶۶)

ترجمہ: ’’حضرت زاذان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ: حضرت ابن عباسؓ بہت زیادہ بیمار ہوئے تو اپنے بیٹوں کو بلوا کر جمع کیا اور فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس نے مکہ سے چل کر پیدل حج کیا، یہاں تک کہ مکہ واپس آ گیا تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے ہر قدم کے بدلہ میں سات سو نیکیاں لکھتے ہیں، ہر نیکی حرم کی نیکیوں کی طرح ہوتی

ہے۔ آپ ﷺ سے عرض کیا گیا کہ: حرم کی نیکیاں کیسی ہوتی ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہر نیکی کے بدلے ایک لاکھ نیکیاں''۔

جو حجاج کرام سفرِ حج میں شریعت کے تمام تقاضوں کو پورا کرتے ہیں، مثلاً: دورانِ سفر نماز باجماعت کی پابندی کرتے ہیں، مرد ہوں یا خواتین اپنی نظروں کی حفاظت کرتے ہیں، اپنے رب کی نافرمانی نہیں کرتے، اپنے ساتھیوں سے جھگڑا نہیں کرتے، احرام کی تمام پابندیوں اور ممنوعاتِ احرام کی رعایت رکھتے ہیں، خواتین پردہ کا اہتمام کرتی ہیں، حرمین کے تقدس کو پامال نہیں کرتے، حج کے ہر ہر رکن، ہر ہر واجب اور ہر ہر سنت کو اس کی روح کے مطابق ادا کرتے ہیں تو ایسے حجاج کرام کی نہ صرف یہ کہ اللہ تبارک وتعالیٰ مغفرت فرمادیتے ہیں، بلکہ ایسے حجاج کرام جس کے لیے دعا کردیں، اللہ تبارک وتعالیٰ ان کی بھی مغفرت فرمادیتے ہیں، جیسا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے آپ ﷺ کا یہ ارشاد مروی ہے:

'' **وعن أبی هريرة رضی اللّٰه عنه قال: قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه عليه وسلم: يغفر للحاج، ولمن استغفر له الحاج**''۔ (الترغیب والترہیب، ج:۲، ص:۱۶۷)

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: حاجی کی بخشش کردی جاتی ہے اور اس کی بھی بخشش کردی جاتی ہے، جس کے لیے حاجی بخشش مانگے''۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کا اپنے بندوں پر کتنا احسان وانعام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر اُتارا تو ان کے ساتھ اس بیت اللہ کو بھی آسمان سے اُتارا، اور وہ اس وقت ایسا صاف اور شفاف تھا کہ اس کے باہر سے دیکھنے والوں کو اس گھر کے اندر کی چیز نظر آتی تھی اور اندر سے دیکھنے والوں کو باہر کی چیز نظر آتی تھی اور یہ اس لیے اُتارا کہ جس طرح ملائکہ میرے عرش کا طواف اور اس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے ہیں، اسی طرح زمین والے بھی اس گھر کا طواف کریں اور اس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھیں، اور پھر اس جنت سے آئے گھر کو اللہ تعالیٰ نے طوفان کے زمانہ میں آسمان پر اُٹھالیا، اس کے بعد انبیاء کرام علیہم السلام اس گھر کا طواف اور حج تو کیا کرتے تھے، لیکن اُنہیں اس کی جگہ معلوم نہ تھی، پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کی جگہ بتلائی تو انہوں نے ان پرانی بنیادوں پر اللہ تبارک وتعالیٰ کا گھر تعمیر کیا، جیسا کہ حضور اکرم ﷺ کے اس ارشاد میں منقول ہے:

'' **وعن عبداللّٰه بن عمرو رضی اللّٰه عنهما قال: لما أهبط اللّٰه آدم عليه السلام من الجنة قال: إنی مهبط معک بيتًا، أو منزلًا يطاف حوله كما يطاف حول عرشی، ويصلی عندهٗ كمايصلی عند عرشی، فلما كان زمن الطوفان رُفِعَ، وكان الأنبياءُ يحجونه، ولا يعلمون مكانَهٗ فَبَوَّأَهٗ لإبراهيم عليه الصلوٰة**

والسلام فبناه من خمسة أجبل: حراء، وثبير، ولبنان، وجبل الطور، وجبل الخير، فتمتعوا منه مااستطعتم‘‘۔ (الترغیب والترہیب، ج:۲،ص:۱۶۸)

ترجمہ: ’’حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے نیچے اُتارا تو فرمایا: میں تمہارے ساتھ ایک گھر بھی اُتار رہا ہوں، جس کے اردگرد طواف کیا جائے گا، جیسے میرے عرش کے اردگرد طواف کیا جاتا ہے۔ اور اس کے پاس نماز پڑھی جائے گی، جیسے میرے عرش کے پاس نماز پڑھی جاتی ہے۔ طوفان کے زمانہ میں اُسے اٹھالیا جاتا تھا اور انبیاء علیہم السلام اس کا حج کیا کرتے تھے اور اس کی جگہ کا اُنہیں علم نہ تھا، تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو وہاں ٹھہرایا، پھر انہوں نے اُسے پانچ پہاڑوں (کے پتھروں) سے اُسے تعمیر کیا: حراء، ثبیر، لبنان، جبلِ طور اور جبلِ خیر، لہٰذا تم سے جتنا ہو سکے اس سے فائدہ اُٹھاؤ‘‘۔

اب یہ کہ حاجی کو اللہ تعالیٰ کے گھر کے طواف، صفا اور مروہ کے درمیان سعی، عرفات کے میدان میں وقوف، رمی جمار، قربانی، طوافِ زیارت وغیرہ جیسے اعمال پر کیا ملتا ہے، اس کے لیے آپ درج ذیل حدیث کو پڑھیں اور اپنے دل کو ٹھنڈا کریں:

’’وروى ابن عمر رضي الله عنهما قال: كنت جالسًا مع النبي صلى الله عليه وسلم في مسجد منًى، فأتاه رجل من الأنصار، ورجل من ثقيف، فسلَّما ثم قالا: يارسول الله! جئنا نسألك، فقال: إن شئتما أخبرتكما بما جئتما تسألاني عنه فعلتُ، وإن شئتما أن أمسك وتسألاني فعلت؟ فقالا: أخبرنا يارسول الله! فقال الثقفي للأنصاري: سل، فقال: أخبرني يا رسول الله! فقال: جئتني تسألني عن مخرجك من بيتك تؤم البيت الحرام، ومالك فيه، وعن ركعتيك بعد الطواف ومالك فيهما، وعن طوافك بين الصفا والمروة ومالك فيه، وعن وقوفك عشية عرفة ومالك فيه، وعن رميك الجمار ومالك فيه، وعن نحرك ومالك فيه مع الإفاضة، فقال: والذي بعثك بالحق لَعَنْ هٰذا جئت أسألك. قال: فإنك إذا خرجت من بيتك تؤم البيت الحرام لاتضع ناقتك خفًّا ولاترفعه إلا كتب الله لك به حسنة، ومحا عنك خطيئة وأما ركعتاك بعد الطواف كعتق رقبة من بني اسمٰعيل عليه السلام، وأما طوافك بالصفا والمروة كعتق سبعين رقبة، وأما وقوفك عشية عرفة، فإن الله

یهبط إلی سماء الدنیا فیباهی بکم الملائکة یقول: عبادی جاء ونی شعثًا من کل فج عمیق یرجون جنتی ، فلو کانت ذنوبکم کعدد الرمل ، أو کقطر المطر ، أو کزبد البحر لغفرتُها ، أفیضوا عبادی مغفوراً لکم ، ولمن شفعتم لهٗ ، وأما رمیک الجمار فلک بکل حصاة رمیتها تکفیر کبیرة من الموبقات ، وأما نحرک فمذخور لک عند ربک ، وأما حلاقک رأسک فلک بکل شعرة حلقتها حسنة ، ویمحٰی عنک بها خطیئة وأما طوافک بالبیت بعد ذٰلک ، فإنک تطوف ولاذنب لک ، یأتی ملک حتّٰی یضع یدیه بین کتفیک فیقول: اعمل فیما تستقبل فقد غفر لک مامضٰی ''۔ (الترغیب والترہیب، ج:۲،ص:۱۷۰تا۱۷۶)

یعنی: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ: میں حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں منیٰ کی مسجد میں حاضر تھا کہ دو شخص ایک انصاری اور ایک ثقفی حاضر خدمت ہوئے اور سلام کے بعد عرض کیا کہ حضور! ہم کچھ دریافت کرنے آئے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: تمہارا دل چاہے تو تم دریافت کرلو اور تم کہو تو میں بتاؤں کہ تم کیا دریافت کرنا چاہتے ہو؟ انہوں نے عرض کیا کہ: آپ ہی ارشاد فرمادیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ: تم حج کے متعلق دریافت کرنے آئے ہو کہ حج کے ارادہ سے گھر سے نکلنے کا کیا ثواب ہے؟ اور طواف کے بعد دو رکعت پڑھنے کا کیا فائدہ اور صفا ومروہ کے درمیان دوڑنے کا کیا ثواب ہے؟ اور عرفات پر ٹھہرنے اور شیطانوں کے کنکریاں مارنے کا اور قربانی کرنے کا اور طوافِ زیارت کرنے کا کیا ثواب ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ: اس پاک ذات کی قسم! جس نے آپ کو نبی بناکر بھیجا ہے، یہی سوالات ہمارے ذہن میں تھے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ: حج کا ارادہ کرکے گھر سے نکلنے کے بعد تمہاری (سواری) اونٹنی جو ایک قدم رکھتی ہے یا اٹھاتی ہے، وہ تمہارے اعمال میں ایک نیکی لکھی جاتی ہے اور ایک گناہ معاف ہوتا ہے اور طواف کے بعد دو رکعتوں کا ثواب ایسا ہے، جیسا ایک عربی غلام کو آزاد کیا ہو اور صفا مروہ کے درمیان سعی کا ثواب ستر غلاموں کو آزاد کرانے کے برابر ہے۔ اور عرفات کے میدان میں جب لوگ جمع ہوتے ہیں تو حق تعالیٰ شانہٗ دنیا کے آسمان پر اتر کر فرشتوں سے فخر کے طور پر فرماتے ہیں کہ میرے بندے دور دور سے پراگندہ بال آئے ہوئے ہیں، میری رحمت کے اُمیدوار ہیں۔ اگر تم لوگوں کے گناہ ریت کے ذروں کے برابر ہوں یا بارش کے قطروں کے برابر ہوں یا سمندر کے جھاگوں کے برابر ہوں، تب بھی میں نے معاف کردیئے۔ میرے بندو! جاؤ، بخشے بخشائے چلے جاؤ، تمہارے بھی گناہ معاف ہیں اور جن کی تم سفارش کرو، ان کے بھی گناہ معاف ہیں۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا کہ: شیطان کے کنکریاں

مارنے کا حال یہ ہے کہ ہر کنکری کے بدلہ میں ایک بڑا گناہ جو ہلاک کر دینے والا ہو معاف ہوتا ہے، اور قربانی کا بدلہ اللہ کے یہاں تمہارے لیے ذخیرہ ہے، اور احرام کھولنے کے وقت سر منڈانے میں ہر بال کے بدلہ میں ایک نیکی ہے اور ایک گناہ معاف ہوتا ہے۔ اس سب کے بعد جب آدمی طوافِ زیارت کرتا ہے تو ایسے حال میں طواف کرتا ہے کہ اس پر کوئی گناہ نہیں ہوتا اور ایک فرشتہ کندھوں کے درمیان ہاتھ رکھ کر کہتا ہے کہ آئندہ از سرِنو اعمال کر، تیرے پچھلے سب گناہ تو معاف ہو چکے‘‘۔

خلاصہ یہ کہ حج کرنے والا اپنے معبود سے عشقِ حقیقی اور سچی محبت کا خوب خوب مظاہرہ کرتا ہے، وہ اس طرح کہ عاشقوں کا کام ہی یہ ہوتا ہے، وہ سب تعلقات ختم کر کے گھر بار، عزیز واقارب، دوست احباب، شہر اور وطن سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کوئے یار کی طرف روانہ ہو جاتا ہے، اس کے لیے سفر کے مصائب اور شدائد میں بھی مزہ ہی آتا ہے:

اذیت ، مصیبت ، ملامت ، بلائیں
تیرے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا

حجاج کرام بھی اپنا سب کچھ چھوڑ کر ایک اللہ کی محبت میں سرشار ہو کر دیوانہ وار اللہ کے گھر کی طرف لپکتے اور پہنچتے ہیں، احرام کی حالت میں عاشقانہ رنگ لیے ہوئے نہ سر پر ٹوپی، نہ بدن پر کُرتہ، نہ خوشبو، نہ زینت، ایک فقیرانہ صورت اور ایک مجنونانہ ہیئت جو کرب و بے چینی کے کمال کو خوب خوب ظاہر کرتی ہے:

نہ رکھ لباس کا اُلجھاؤ تن پہ دستِ جنوں
کیا چاک گریباں تو پھاڑ دامن بھی

جب حاجی اللہ تعالیٰ کے گھر پہنچتا ہے تو بے اختیار آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی بن جاتی ہے اور بزبانِ حال حاجی یہ کہتا ہے:

نالہ کر لینے دیں للہ نہ چھیڑیں احباب
ضبط کرتا ہوں تو تکلیف سوا ہوتی ہے

اور کہتا ہے:

جذبِ دل نے آج کوئے یار میں پہنچا دیا
جیتے جی میں گلشنِ جنت میں آ گیا

اللہ تبارک وتعالیٰ تمام مسلمانوں کو حج کی سعادت سے بہرہ مند فرمائیں، آمین۔

وصلی اللّٰہ تعالٰی علٰی خیر خلقہٖ سیدنا محمد وعلٰی آلہٖ وصحبہٖ أجمعین

عصمتِ انبیاءؑ وحرمتِ صحابہؓ

محدث العصر علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ

یہ حقیقت مسلم اور ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ نبوت ورسالت وہ اعلیٰ ترین منصب ہے جو حق تعالیٰ ذکرہٗ کی طرف سے مخصوص بندوں کو عطا کیا جاتا ہے۔ تمام کائنات میں انسان اشرف المخلوقات ہے اور نبوت انسانیت کی آخری معراجِ کمال، انسانیت کے بقیہ تمام مراتب وکمالات اس سے پست اور فروتر ہیں۔ انسانی فکر کی کوئی بلندی نبوت کی حدوں کو نہیں چھوسکتی، نہ انسانیت کا کوئی شرف وکمال اس کی گردِراہ کو پہنچ سکتا ہے، اس سے اوپر بس ایک ہی مرتبہ ہے اور وہ ہے حق تعالیٰ کی ربوبیت والوہیت کا مرتبہ! منصبِ نبوت عقولِ انسانی سے بالاتر ہے، اس کی پوری حقیقت صرف وہی جانتا ہے جس نے یہ منصب عطا فرمایا، یا پھر ان مقدس ہستیوں کو معلوم ہوسکتی ہے جن کو اس منصب رفیع سے سرفراز کیا گیا۔ ان کے علاوہ تمام لوگوں کا علم وفہم سرِّ نبوت کی دریافت سے عاجز اور عقل اس کی ٹھیک ٹھیک حقیقت وکُنہ کے ادراک سے قاصر ہے۔ جس طرح ایک جاہل علم کی حقیقت سے بے خبر ہے، اسی طرح غیر نبی نبوت کی حقیقت سے ناآشنا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوگی کہ رسالت ونبوت کا منصب رفیع تو درکنار معمولی ہنر وفن کا بھی یہی حال ہے، کسی فن کی صحیح حقیقت تک رسائی اسی صاحبِ کمال کے لیے ممکن ہے جسے وہ فن حاصل ہو اور اسی حد تک ممکن ہے جس حد تک اُسے فنی رسوخ وکمال حاصل ہو۔

ہمارے حضرت استاذ امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیری دیوبندی (نور اللہ مرقدہٗ) فرمایا کرتے تھے کہ:

''نبوت تو کیا اجتہاد کی حقیقت کے ادراک سے بھی ہم قاصر ہیں۔''

یعنی ''اجتہاد'' کے بارے میں جو کچھ ہم جانتے ہیں، وہ محض اس کی ظاہری سطح ہے اور جتنی معلومات ہمیں حاصل ہیں، وہ صرف سطحی معلومات ہیں (اسے منطقی اصطلاح میں علم بالوجہ کہتے ہیں) ورنہ اجتہاد کی حقیقت کا صحیح ادراک صرف مجتہد کو ہوسکتا ہے، جسے یہ ملکہ حاصل ہو۔ اسی طرح نبوت کا

علم بھی عام انسانوں کو محض آثار ولوازم کے اعتبار سے ہے، نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ:

نبوت کے لیے حق تعالیٰ جل ذکرہٗ ایک ایسی برگزیدہ اور معصوم شخصیت کا انتخاب فرماتا ہے جو اپنے ظاہر و باطن، قلب وقالب، روح وجسد ہر اعتبار سے عام انسانوں سے ممتاز ہوتا ہے، وہ ایسا پاک طینت اور سعید الفطرت پیدا کیا جاتا ہے کہ اس کی تمام خواہشات رضاء ومشیت الٰہی کے تابع ہوتی ہیں، ردائے عصمت اس کے زیب تن ہوتی ہے، حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ ہر دم اس کی نگرانی کرتی ہے، اس کی ہر حرکت وسکون پر حفاظتِ خداوندی کا پہرہ بٹھادیا جاتا ہے اور وہ نفس وشیطان کے تسلط واستیلاء سے بالاتر ہوتا ہے، ایسی شخصیت سے گناہ ومعصیت اور نافرمانی کا صدور ناممکن اور منطقی اصطلاح میں محال وممتنع ہے، اسی کا نام عصمت ہے (۱) اور ایسی ہستی کو معصوم کہا جاتا ہے، عصمت لازمۂ نبوت ہے، جس طرح یہ تصور کبھی نہیں کیا جاسکتا کہ کسی لمحہ نبوت نبی سے الگ ہوجائے، اسی طرح اس بات کا وہم وگمان بھی نہیں کیا جاسکتا کہ عصمت' نبوت اور نبی سے ایک آن کے لیے بھی جدا ہوسکتی ہے، معاذ اللہ۔

حضراتِ علماء نے تحقیق فرمائی ہے کہ ایک ہے معصوم اور ایک ہے محفوظ، معصوم وہ ہے جس سے گناہ ومعصیت کا صدور محال ہو، اور محفوظ وہ ہے جس سے صدورِ معصیت محال تو نہ ہو، لیکن کوئی معصیت صادر نہ ہو یا آسان اور سادہ لفظوں میں یوں تعبیر کریں گے کہ معصوم وہ ہے جو گناہ کر ہی نہیں سکتا اور محفوظ کے معنی یہ ہیں کہ گناہ کرتو سکتا ہے لیکن کرتا نہیں، اس لیے کہا جاتا ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام معصوم ہیں اور اولیاء کرام رحمہم اللہ محفوظ ہیں۔

الغرض نبوت ورسالت کے عظیم ترین منصب کے لیے حق تعالیٰ اسی شخصیت کو بحیثیت نبی ورسول کے منتخب کرتا ہے جو حسب ونسب، اخلاق واعمال، عقل وبصیرت، عزم وہمت اور تمام کمالات میں اپنے دور کی فائق ترین شخصیت ہو۔ نبی تمام جسمانی وروحانی کمالات میں یکتائے زمانہ ہوتا ہے اور کسی غیر نبی کو کسی معتد بہ کمال میں اس پر فوقیت نہیں ہوتی۔ قرآنی وشرعی الفاظ میں اس شخصیت کا ''انتخاب''، ''اجتباء'' اور ''اختیار'' خود حق تعالیٰ فرماتا ہے، کون نہیں جانتا کہ حق تعالیٰ کا علم کائنات کے ذرہ ذرہ کو محیط ہے، اس کے لیے ظاہر وباطن اور سر وجہر سب عیاں ہے، ماضی ومستقبل اور حال کے تمام حالات بیک وقت اس کے علم میں ہیں، اس میں نہ غلطی کا امکان، نہ جہل کا تصور، قرآن کریم کی بے شمار آیات میں یہ حقیقت بار بار بیان کی گئی ہے:

حاشیہ (۱): اس کے یہ معنی نہیں کہ انبیاءِ کرام علیہم السلام سے قدرت سلب کرلی جاتی ہے، بلکہ عصمت کا مدار ان ہی دو چیزوں پر ہے، جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا، یعنی اول تو ان کی فطرت اتنی پاکیزہ اور مصفیٰ مزکیٰ ہوتی ہے کہ وہ گناہ ومعصیت کا تصور بھی نہیں کرسکتے اور گناہ کا تصور فطرۃً ان کے لیے ناقابل برداشت ہے۔ دوم یہ کہ حفاظت الٰہی کی نگرانی ایک لمحہ کے لیے ان سے جدا نہیں ہوتی، ظاہر ہے کہ ان دو باتوں کے ہوتے ہوئے صدورِ معصیت کا امکان نہیں رہتا۔ انتہیٰ (مدیر)

’’اِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا‘‘۔ (النساء:۳۲)

’’اور اللہ ہر چیز کو جانتا ہے‘‘۔

’’وَمَا یَعْزُبُ عَنْ رَّبِّکَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّۃٍ فِی الْأَرْضِ وَلَا فِی السَّمَاءِ ‘‘۔ (یونس:۶۱)

’’اور غائب نہیں تیرے رب سے کوئی ذرہ بھر چیز بھی، نہ زمین میں نہ آسمان میں‘‘۔

’’ یَعْلَمُ سِرَّکُمْ وَجَھْرَکُمْ‘‘۔ (الانعام:۳)

’’وہ جانتا ہے تمہارے پوشیدہ کو اور ظاہر کو‘‘۔

ظاہر ہے کہ جب حق تعالیٰ کا علم محیط‘ نبوت ورسالت کے لیے کسی شخصیت کو منتخب کرے گا تو اس میں کسی نقص کے احتمال کی گنجائش نہیں رہ جاتی، اس منصب کے لیے جس مقدس ہستی پر حق تعالیٰ کی نظر انتخاب پڑے گی اور جسے تمام انسانوں سے چھانٹ کر اس عہدہ کے لیے چنا جائے گا، وہ اپنے دور کی کامل ترین، جامع ترین، اعلیٰ ترین اور موزوں ترین شخصیت ہوگی، البتہ خود انبیاء ورسلؑ کے درمیان کمالات ودرجات میں تفاوت اور فرقِ مراتب اور بات ہے۔

نیز یہ حقیقت بھی مسلم ہے کہ نبوت ورسالت محض عطیۂ الٰہی ہے، کسب واکتساب سے اس کا تعلق نہیں کہ محنت ومجاہدہ اور ریاضت ومشقت سے حاصل ہوجائے۔ دنیا کا ہر کمال محنت ومجاہدہ سے حاصل ہوسکتا ہے، لیکن نبوت ورسالت حق تعالیٰ کا اجتبائی عطیہ ہے، وہ جس کو چاہتا ہے اس منصب کے لیے چن لیتا ہے، قرآن کریم کی متعدد آیات میں یہ تصریحات موجود ہیں:

’’ اَللّٰہُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلاً وَّمِنَ النَّاسِ۔‘‘ (الحج:۷۵)

’’اللہ چن لیتا ہے فرشتوں سے پیغامبر اور انسانوں سے‘‘۔

’’ أَللّٰہُ أَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ‘‘۔ (الانعام:۱۲۴)

’’اللہ کو خوب علم ہے جہاں رکھتا ہے وہ اپنے پیغامات‘‘۔

ان حقائقِ شرعیہ کو سمجھ لینے کے بعد یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی نبی ورسول فرائضِ نبوت میں کوتاہی بھی کرسکتا ہے، کجا کہ کسی نبی نے - معاذ اللہ - اپنے فرائض منصبی میں کوتاہیاں کی ہوں، اس لیے یہ کہنا کہ ’’فلاں نبی سے فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں کچھ کوتاہیاں ہوگئی تھیں‘‘۔ ’’نبی ادائے رسالت میں کوتاہی کرگیا‘‘۔ یا یہ کہ ’’فلاں نبی بغیر اذنِ الٰہی کے اپنی ڈیوٹی سے ہٹ گیا۔‘‘ انتہائی کوتاہی کی بات ہے اور وہ اپنے اندر بڑے سنگین مضمرات رکھتی ہے۔ اسی طرح کسی مشکل مقام کی تہ کو نہ پہنچنے کی بنا پر یہ اٹکل پچو کلّیہ گھڑ لینا کہ ’’عام انسانوں کی طرح نبی بھی مومن کے بلند ترین معیارِ کمال پر ہر وقت قائم نہیں رہ سکتا، وہ بھی بسا اوقات تھوڑی دیر کے لیے اپنی بشری کمزوری سے مغلوب ہوجاتا ہے اور جب اللہ کی طرف سے اُسے متنبہ کیا جاتا ہے کہ یہ عمل محض ایک ’’جاہلیت کا جذبہ‘‘ ہے تو نبی فوراً اسلامی طرزِ فکر کی طرف پلٹ آتا ہے۔‘‘ نہایت خطرناک بات اور مقامِ نبوت سے ناشناسائی کی عبرت ناک مثال ہے۔

چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

اسی طرح یہ کہنا کہ ’’نبی اور رسول پر کوئی وقت ایسا بھی آتا ہے......اور آنا چاہیے...... جب کہ اس سے عصمت کا پردہ اٹھالیا جاتا ہے اور اس سے ایک دو گناہ کرائے جاتے ہیں، تاکہ اس کی بشریت ظاہر ہو۔‘‘ یہ ایک ایسا خطرناک قسم کا غلط فلسفہ (سوفسطائیت) ہے، جس سے تمام شرائعِ الٰہیہ اور ادیانِ سماویہ کی بنیادیں ہل جاتی ہیں۔

نبوت سے عصمت کے جدا ہوجانے کے معنی یہ ہوئے کہ عین اس وقت نبی کی حیثیت ایک ایسی شخصیت کی نہیں ہوتی جو امت کے لیے اسوہ اور نمونہ ہو، اور جسے امین ومأمون قرار دیا گیا ہو، اس وقت اس کی حیثیت ایک عام انسان کی سی ہوگی یا زیادہ واضح الفاظ میں یہ کہیے کہ عین اس حالت میں جب کہ نبی سے عصمت اٹھالی جاتی ہے، وہ نبوت اور لوازمِ نبوت سے موصوف نہیں ہوتا، ظاہر ہے کہ اگر یہ غلط منطق تسلیم کرلی جائے تو سارا دین ختم ہوجاتا ہے، نبی اور رسول کی ہر بات- معاذ اللہ- مشکوک ہوجاتی ہے اور اس کا کوئی قول وعمل اور تلقین وتعلیم قابل اعتماد نہیں رہتی، کیونکہ ہر لمحہ یہ احتمال رہے گا کہ شاید یہ ارتفاعِ عصمت اور انخلاع عن النبوت کا وقت ہو۔ بظاہر یہ بات جو بڑے حسین وجمیل فلسفہ کی شکل میں پیش کی گئی ہے، غور کیجیے تو یہ اس قدر غیر معقول اور ناقابل برداشت ہے کہ کوئی معقول آدمی جو شریعتِ الٰہی کو سمجھتا ہو، اس کی جرأت تو کجا اس کا تصور تک نہیں کرسکتا! جن لوگوں کی زبان وقلم سے یہ بات نکلی ہے- اور افسوس ہے کہ بڑے اصرار وتکرار سے مسلسل نکلتی جارہی ہے- ان کے بارے میں یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ انہیں نہ علم کی حقیقت تک رسائی ہوئی ہے، نہ نبوت کے تقاضوں کو انہوں نے صحیح سمجھا ہے۔

اور یہ بات بھی کسی علم ودانش کا پتہ نہیں دیتی کہ جب تک ہم انبیاء کرام علیہم السلام کو عام انسانوں کی طرح دوچار گناہوں میں مبتلا نہ دیکھ لیں، اس وقت تک ہمیں ان کی بشریت کا یقین ہی نہیں آئے گا۔ کون نہیں جانتا کہ انبیاء کرام (علیہم السلام) کھاتے ہیں، پیتے ہیں، انہیں صحت ومرض جیسے بیسیوں انسانی عوارض لاحق ہوتے ہیں، وہ انسانوں سے پیدا ہوتے ہیں اور ان سے انسانی نسل چلتی ہے، علاوہ ازیں وہ بار بار اپنی بشریت کا اعلان فرماتے ہیں، کیا ان تمام چیزوں کے بعد بھی اس بات کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ جب تک ان سے عصمت نہیں اٹھالی جاتی اور دو ایک گناہ نہیں ہونے دیے جاتے، تب تک ان کی بشریت مشتبہ رہے گی؟ اور ہمیں ان کی بشریت کا یقین نہیں آئے گا؟

یہاں یہ نکتہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ بھول چوک اور خطأ ونسیان تو خاصۂ بشریت ہے، مگر گناہ ومعصیت مقتضائے بشریت نہیں، بلکہ خاصۂ شیطانیت ہے۔ انسان سے گناہ ہوتا ہے تو محض تقاضائے بشریت کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ شیطان کے تسلط واغوا سے ہوتا ہے، اس لیے گناہوں کے ارتکاب سے انبیاء علیہم السلام کی بشریت ثابت نہیں ہوگی، بلکہ اور ہی کچھ ثابت ہوگا اور جو لوگ بھول چوک

اور ''معصیت'' کے درمیان فرق نہیں کر سکتے، انہیں آخر کس نے کہا ہے کہ وہ ان نازک علمی مباحث میں اُلجھ کر '' ضلوا فأضلوا '' (خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا) کا مصداق بنیں۔ بہرحال یہ عصمت اور کمالاتِ نبوت تو ہر نبی کے لیے لازم وضروری ہیں۔

اب غور فرمایئے کہ جس مقدس ترین شخصیت کو تمام انبیاء ورسلؑ کی سیادت وامامت کے مقام پر کھڑا کیا گیا ہو، جسے ختم نبوت ورسالتِ کبریٰ کا تاج پہنایا گیا ہو، اور جسے ع ''بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر'' کے اعلیٰ ترین منصب سے سرفراز کیا گیا ہو(بآبائنا وأمهاتنا صلى الله عليه وسلم) کائنات کی اس بلند ترین ہستی کے شرف وکمال، طہارت ونزاہت، حرمت وعظمت، عفت وعصمت اور رسالت ونبوت کا مقام کون معلوم کرسکتا ہے؟ اگر ایسی فوق الادراک ہستی کے بارے میں بھی کوئی ایسا کلمہ کہا جائے کہ کسی وقت غیر معصومیت ان پر بھی آسکتی ہے تو کیا اس عظیم ترین جرم کی انتہا معلوم ہوسکتی ہے؟

حضرت رسول اللہ ﷺ جب خاتم النبیین ہوئے، اور منصب رسالت ونبوت کی سیادتِ کبریٰ سے مشرف ہوئے اور آپ ﷺ کی شریعت کو آخری شریعت اور قیامت تک آنے والی تمام قوموں اور نسلوں کے لیے آخری قانون بنایا گیا تو اس کے لیے دو چیزوں کی ضرورت تھی، ایک یہ کہ آسمانی قانون قیامت تک جوں کا توں محفوظ رہے، ہر قسم کی تحریف وتبدیل سے اس کی حفاظت کی جائے، الفاظ کی بھی اور معانی کی بھی، کیونکہ اگر الفاظ کی حفاظت ہو اور معانی کی حفاظت نہ ہو، تو یہ حفاظت بالکل بے معنی ہے۔ دوم یہ کہ جس طرح علمی حفاظت ہو، اسی طرح عملی حفاظت بھی ہو۔ اسلام محض چند اصول ونظریات اور علوم وافکار کا مجموعہ نہیں، بلکہ وہ اپنے جلو میں ایک نظام عمل لے کر چلتا ہے، وہ جہاں زندگی کے ہر شعبہ میں اصول وقواعد پیش کرتا ہے، وہاں ایک ایک جزئیہ کی عملی تشکیل بھی کرتا ہے، اس لیے یہ ضروری تھا کہ شریعت محمدیہ (علی صاحبہا الف الف صلوٰۃ وسلام) کی علمی وعملی دونوں پہلوؤں سے حفاظت کی جائے اور قیامت تک ایک ایسی جماعت کا سلسلہ قائم رہے جو شریعت مطہرہ کے علم وعمل کی حامل وامین ہو، حق تعالیٰ نے دین محمدی کی دونوں طرح حفاظت فرمائی، علمی بھی اور عملی بھی۔

حفاظت کے ذرائع میں صحابۂ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کی جماعت سرفہرست ہے، ان حضرات نے براہِ راست صاحب وحی ﷺ سے دین کو سمجھا، دین پر عمل کیا اور اپنے بعد آنے والی نسل تک دین کو من وعَن پہنچایا، انہوں نے آپ ﷺ کے زیر تربیت رہ کر اخلاق واعمال کو ٹھیک ٹھیک منشائے خداوندی کے مطابق درست کیا، سیرت وکردار کی پاکیزگی حاصل کی، تمام باطل نظریات سے کنارہ کش ہو کر عقائد حقہ اختیار کیے، رضائے الٰہی کے لیے اپنا سب کچھ رسول اللہ ﷺ کے قدموں پر نچھاور کردیا، ان کے کسی طرزِ عمل میں ذرا خامی نظر آئی تو فوراً حق جل مجدہٗ نے اس کی اصلاح فرمائی، الغرض حضراتِ صحابہ کرامؓ کی جماعت اس پوری کائنات میں وہ خوش قسمت جماعت

ہے، جن کی تعلیم وتربیت اور تصفیہ وتزکیہ کے لیے سرورِ کائنات محمد رسول اللہ ﷺ کو معلم ومزکّی اور استاذ واتالیق مقرر کیا گیا۔ اس انعامِ خداوندی پر وہ جتنا شکر کریں کم ہے، جتنا فخر کریں بجا ہے:

’’ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْبَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلاً مِّنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ أٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ‘‘۔ (آل عمران:۱۶۴)

’’بخدا بہت بڑا احسان فرمایا اللہ نے مومنین پر کہ بھیجا ان میں ایک عظیم الشان رسول ان ہی میں سے، وہ پڑھتا ہے ان کے سامنے اس کی آیتیں اور پاک کرتا ہے ان کو اور سکھاتا ہے ان کو کتاب اور گہری دانائی۔ بلاشبہ وہ اس سے پہلے صریح گمراہی میں تھے‘‘۔

آنحضرت ﷺ کی علمی وعملی میراث اور آسمانی امانت چونکہ ان حضرات کے سپرد کی جارہی تھی، اس لیے ضروری تھا یہ حضرات آئندہ نسلوں کے لیے قابلِ اعتماد ہوں، چنانچہ قرآن وحدیث میں جابجا ان کے فضائل ومناقب بیان کیے گئے، چنانچہ:

الف: ...... وحیِ خداوندی نے ان کی تعدیل فرمائی، ان کا تزکیہ کیا، ان کے اخلاص وللّٰہیت پر شہادت دی اور اُنہیں یہ رتبۂ بلند ملا کہ ان کو رسالت محمدیہ (علیٰ صاحبہا الف صلاۃ وسلام) کے عادل گواہوں کی حیثیت سے ساری دنیا کے سامنے پیش کیا:

’’ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ أَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعاً سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًامِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سِيْمَا هُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ أَثَرِالسُّجُوْدِ‘‘۔ (الفتح:۲۹)

’’محمد (ﷺ) اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں اور جو ایماندار آپ (ﷺ) کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت اور آپس میں شفیق ہیں، تم ان کو دیکھو گے رکوع، سجدے میں۔ وہ چاہتے ہیں صرف اللہ کا فضل اور اس کی رضا مندی، ان کی علامت ان کے چہروں میں سجدے کا نشان ہے‘‘۔

گویا یہاں ’’مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ‘‘ (محمد-ﷺ- اللہ کے رسول ہیں) ایک دعویٰ ہے اور اس کے ثبوت میں حضرات صحابہ کرامؓ کی سیرت وکردار کو پیش کیا گیا ہے کہ جسے آنحضرت ﷺ کی صداقت میں شک وشبہ ہو، اسے آپ ﷺ کے ساتھیوں کی پاکیزہ زندگی کا ایک نظر مطالعہ کرنے کے بعد خود اپنے ضمیر سے یہ فیصلہ لینا چاہیے کہ جس کے رفقاء اتنے بلند سیرت اور پاکباز ہوں وہ خود صدق وراستی کے کتنے اونچے مقام پر فائز ہوں گے:

’’ کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کردیا ‘‘

ب: ...... حضراتِ صحابہؓ کے ایمان کو ’’معیارِحق‘‘ قرار دیتے ہوئے نہ صرف لوگوں کو اس کا نمونہ پیش کرنے کی دعوت دی گئی، بلکہ ان حضرات کے بارے میں لب کشائی کرنے والوں پر نفاق وسفاہت کی دائمی مہر ثبت کر دی گئی:

’’ وَإِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ اٰمِنُوۡا كَمَا اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوۡا أَ نُؤۡمِنُ كَمَا اٰمَنَ السُّفَهَاءُ أَلَا إِنَّهُمۡ هُمُ السُّفَهَاءُ وَلٰكِنۡ لَّا يَعۡلَمُوۡنَ‘‘۔ (البقرۃ:۱۳)

’’اور جب ان (منافقوں) سے کہا جائے: تم بھی ایسا ہی ایمان لاؤ جیسا دوسرے لوگ (صحابہ کرامؓ) ایمان لائے ہیں، تو جواب میں کہتے ہیں’’ کیا ہم ان بے وقوفوں جیسا ایمان لائیں؟ سن رکھو یہ خود ہی بے وقوف ہیں، مگر نہیں جانتے‘‘۔

ج: ...... حضراتِ صحابہ کرامؓ کو بار بار’’ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡهُ‘‘ (اللہ ان سے راضی ہوا، وہ اللہ سے راضی ہوئے) کی بشارت دی گئی اور اُمت کے سامنے یہ اس شدت وکثرت سے دہرایا گیا کہ صحابہ کرامؓ کا یہ لقب امت کا تکیہ کلام بن گیا، کسی نبی کا اسم گرامی آپ ’’علیہ السلام‘‘ کے بغیر نہیں لے سکتے اور کسی صحابیِ رسول (ﷺ) کا نام نامی ’’رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ‘‘ کے بغیر مسلمان کی زبان پر جاری نہیں ہوسکتا، ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف ظاہر کو دیکھ کر راضی نہیں ہوا، نہ صرف ان کے موجودہ کارناموں کو دیکھ کر، بلکہ ان کے ظاہر وباطن اور حال ومستقبل کو دیکھ کر ان سے راضی ہوا ہے، یہ گویا اس بات کی ضمانت ہے کہ آخر دم تک ان سے رضائے الٰہی کے خلاف کچھ صادر نہیں ہوگا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جس سے خدا راضی ہوجائے، خدا کے بندوں کو بھی اس سے راضی ہو جانا چاہیے۔ کسی اور کے بارے میں تو ظن وتخمین ہی سے کہا جاسکتا ہے کہ خدا اس سے راضی ہے یا نہیں؟ مگر صحابہ کرامؓ کے بارے میں تو نصِ قطعی موجود ہے، اس کے باوجود اگر کوئی ان سے راضی نہیں ہوتا تو گویا اُسے اللہ تعالیٰ سے اختلاف ہے اور پھر اتنی بات کو کافی نہیں سمجھا گیا کہ ’’اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوا‘‘ بلکہ اسی کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ اللہ سے راضی ہوئے، یہ ان حضرات کی عزت افزائی کی انتہا ہے۔

د: ...... حضرات صحابہ کرامؓ کے مسلک کو ’’معیاری راستہ‘‘ قرار دیتے ہوئے اس کی مخالفت کو براہِ راست رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کے ہم معنی قرار دیا گیا اور ان کی مخالفت کرنے والوں کو وعید سنائی گئی:

’’ وَمَنۡ يُّشَاقِقِ الرَّسُوۡلَ مِنۡ بَعۡدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الۡهُدٰى وَيَتَّبِعۡ غَيۡرَ سَبِيۡلِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى‘‘۔ (النساء:۱۱۵)

’’اور جو شخص مخالفت کرے رسول اللہ (ﷺ) کی جب کہ اس کے سامنے ہدایت کھل چکی اور چلے مومنوں کی راہ چھوڑ کر، ہم اُسے پھیر دیں گے جس طرف پھرتا ہے‘‘۔

آیت میں ’’المؤمنین‘‘ کا اولین مصداق اصحاب النبی (ﷺ) کی مقدس جماعت ہے، رضی اللّٰہ عنھم ۔اس سے واضح ہوتا ہے کہ اتباعِ نبوی کی صحیح شکل صحابہ کرامؓ کی سیرت وکردار اور ان کے اخلاق واعمال کی پیروی میں منحصر ہے اور یہ جب ہی ممکن ہے جب کہ صحابہؓ کی سیرت کو اسلام کے اعلیٰ معیار پر تسلیم کیا جائے۔

ہ: ...... اورسب سے آخری بات یہ کہ اُنہیں آنحضرت ﷺ کے سایۂ عاطفت میں آخرت کی ہرعزت سے سرفراز کرنے اور ہر ذلت ورسوائی سے محفوظ رکھنے کا اعلان فرمایا گیا:

’’يَوْمَ لَا يُخْزِيْ اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا مَعَهٗ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ أَيْدِيْهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ‘‘۔ (التحریم:۸)

’’جس دن رسوانہیں کرے گا اللہ تعالیٰ نبی کو اور جو مومن ہوئے آپ (ﷺ) کے ساتھ، ان کا نور دوڑتا ہوگا ان کے آگے اور ان کے داہنے‘‘۔

اس قسم کی بیسیوں نہیں، بلکہ سینکڑوں آیات میں صحابہ کرامؓ کے فضائل ومناقب مختلف عنوانات سے بیان فرمائے گئے ہیں اور اس سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ دین کے سلسلۂ سند کی یہ پہلی کڑی اور حضرت خاتم الانبیاء ﷺ کے صحبت یافتہ حضرات کی جماعتؓ- معاذ اللہ- نا قابل اعتماد ثابت ہو، ان کے اخلاق واعمال میں خرابی نکالی جائے اور ان کے بارے میں یہ فرض کرلیا جائے کہ وہ دین کی علمی وعملی تدبیر نہیں کرسکے تو دین اسلام کا سارا ڈھانچہ ہل جاتا ہے اور خاکم بدہن! رسالت محمدیہ مجروح ہوجاتی ہے۔

دنیا کا ایک معروف قاعدہ ہے کہ اگر کسی خبر کو رد کرنا ہو تو اس کے راویوں کو جرح وقدح کا نشانہ بناؤ، ان کی سیرت وکردار کو ملوث کرو اور ان کی ثقاہت وعدالت کو مشکوک ثابت کرو، صحابہ کرامؓ چونکہ دین محمدی کے سب سے پہلے راوی ہیں، اس لیے چالاک فتنہ پردازوں نے جب دین اسلام کے خلاف سازش کی اور دین سے لوگوں کو بدظن کرنا چاہا تو ان کا سب سے پہلا ہدف صحابہ کرامؓ تھے، چنانچہ تمام فرقِ باطلہ اپنے نظریاتی اختلاف کے باوجود جماعتِ صحابہؓ کو ہدفِ تنقید بنانے میں متفق نظر آتے ہیں، ان کی سیرت وکردار کو داغدار بنانے اور ان کی شخصیت کو نہایت گھناؤنے رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی، اُن کے اخلاق واعمال پر تنقیدیں کی گئیں، ان پر مال وجاہ کی حرص میں احکامِ خداوندی سے پہلو تہی کرنے کے الزامات دھرے گئے۔ ان پر خیانت، غصب اور کنبہ پروری، اقربا نوازی کی تہمتیں لگائی گئیں اور غلو وانتہا پسندی کی حد ہے کہ جن پاکیزہ ہستیوں کے ایمان کو حق تعالیٰ نے ’’معیار‘‘ قرار دے کر ان جیسا ایمان لانے کی لوگوں کو دعوت دی تھی: ’’ أٰمِنُوْا كَمَا أٰمَنَ النَّاسُ ‘‘ انہی کے ایمان وکفر کا مسئلہ زیر بحث لایا گیا، اور تکفیر وتفسیق تک نوبت پہنچا دی گئی، جن جانبازوں نے دین اسلام کو اپنے خون سے سیراب کیا تھا، انہی کے بارے میں چیخ چیخ کر کہا جانے لگا کہ وہ اسلام کے اعلیٰ معیار پر قائم نہیں رہے

تھے، جن مردانِ خدا کے صدق وامانت کی خدا تعالیٰ نے گواہی دی تھی:

''رِجَالٌ صَدَقُوْا مَاعَاهَدُوْا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا''۔ (الاحزاب:۲۳)

''یہ وہ ''مرد'' ہیں جنہوں نے سچ کر دکھایا جو عہد انہوں نے اللہ سے باندھا، بعض نے تو جانِ عزیز تک اسی راستہ میں دے دی اور بعض (بے چینی سے) اس کے منتظر ہیں اور ان کے عزم واستقلال میں ذرا تبدیلی نہیں ہوئی''۔

انہی کے حق میں بتایا جانے لگا کہ نہ وہ صدق وامانت سے موصوف تھے، نہ اخلاص وایمان کی دولت انہیں نصیب تھی، جن مخلصوں نے اپنے بیوی بچوں کو، اپنے گھر بار کو، اپنے عزیز واقارب کو، اپنے دوست احباب کو، اپنی ہر لذت وآسائش کو، اپنے جذبات وخواہشات کو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے، اس کے رسول ﷺ پر قربان کر دیا تھا، انہی کو یہ طعنہ دیا گیا کہ وہ محض حرص وہوا کے غلام تھے اور اپنے مفاد کے مقابلے میں خدا اور رسول ﷺ کے احکام کی انہیں کوئی پروا نہیں تھی، لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا۔

ظاہر ہے کہ اگر امت کا معدہ ان بے ہودہ نظریات کی مردہ مکھی کو قبول کر لیتا اور ایک بار بھی صحابہ کرامؓ امت کی عدالت میں مجروح قرار پاتے تو دین کی پوری عمارت گر جاتی، قرآنِ کریم اور احادیثِ نبویہ سے امان اُٹھ جاتا اور یہ دین جو قیامت تک رہنے کے لیے آیا تھا، ایک قدم آگے نہ چل سکتا، مگر یہ سارے فتنے جو بعد میں پیدا ہونے والے تھے، علم الٰہی سے اوجھل نہیں تھے، اس کا اعلان تھا:

''وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ''۔ (الصف:۸)

''اور اللہ اپنا نور پورا کر کے رہے گا، خواہ کافروں کو کتنا ناگوار ہو''۔

یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ نے بار بار مختلف پہلوؤں سے صحابہ کرامؓ کا تزکیہ فرمایا، ان کی توثیق وتعدیل فرمائی اور قیامت تک کے لیے یہ اعلان فرما دیا:

''أُولٰئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْإِيْمَانَ وَأَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ''۔ (المجادلۃ:۲۲)

''یہی وہ لوگ ہیں کہ اللہ نے لکھ دیا ان کے دل میں ایمان اور مدد دی ان کو اپنی خاص رحمت سے''۔

ادھر نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ کرامؓ کے بے شمار فضائل بیان فرمائے، بالخصوص خلفائے راشدینؓ: حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمان ذوالنورینؓ، حضرت علی مرتضیٰ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے فضائل کی تو انتہا کر دی، جس کثرت وشدت اور تواتر وتسلسل کے ساتھ آنحضرت ﷺ نے صحابہ کرامؓ کے فضائل ومناقب، ان کے مزایا وخصوصیات اور ان کے اندرونی اوصاف وکمالات کو بیان فرمایا، اس سے واضح ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنی امت کے علم میں یہ بات لانا چاہتے تھے کہ انہیں عام افرادِ امت پر قیاس کرنے کی غلطی نہ کی جائے، ان حضرات کا

تعلق چونکہ براہِ راست آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی سے ہے، اس لیے ان کی محبت عین محبتِ رسول ہے اور ان کے حق میں ادنیٰ لب کشائی ناقابلِ معافی جرم فرمایا:

’’ أللّٰہ أللّٰہ فی أصحابی، أللّٰہ أللّٰہ فی أصحابی، لا تتخذوھم غرضًا من بعدی، فمن أحبھم فبحبی أحبھم، ومن أبغضھم فببغضی أبغضھم ، ومن أذاھم فقد أذانی، ومن أذانی فقد أذی اللّٰہ ومن أذی اللّٰہ فیوشک أن یأخذہٗ ‘‘۔

’’اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرو میرے صحابہؓ کے معاملہ میں، مکرر کہتا ہوں اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرو میرے صحابہؓ کے معاملہ میں، ان کو میرے بعد ہدفِ تنقید نہ بنانا، کیونکہ جس نے ان سے محبت کی تو میری محبت کی بنا پر اور جس نے ان سے بدظنی کی تو مجھ سے بدظنی کی بنا پر، جس نے ان کو ایذا دی، اس نے مجھے ایذا دی اور جس نے مجھے ایذا دی، اس نے اللہ کو ایذا دی اور جس نے اللہ کو ایذا دی تو قریب ہے کہ اللہ اسے پکڑ لے‘‘۔

امت کو اس بات سے بھی آگاہ فرمایا گیا کہ تم میں سے اعلیٰ سے اعلیٰ فرد کی بڑی سے بڑی نیکی ادنیٰ صحابیؓ کی چھوٹی سے چھوٹی نیکی کا مقابلہ نہیں کرسکتی، اس لیے ان پر زبانِ تشنیع دراز کرنے کا حق امت کے کسی فرد کو حاصل نہیں، ارشاد ہے:

’’ لا تسبوا أصحابیؓ، فلوأن أحدکم أنفق مثل أحد ذھبًا مابلغ مُدّ أحدھم ولا نصیفہ‘‘۔ (بخاری ومسلم)

’’میرے صحابہؓ کو برا بھلا نہ کہو (کیونکہ تمہارا وزن ان کے مقابلہ میں اتنا بھی نہیں جتنا پہاڑ کے مقابلہ میں ایک تنکے کا ہوسکتا ہے، چنانچہ) تم میں سے ایک شخص احد پہاڑ کے برابر سونا بھی خرچ کردے تو ان کے ایک سیر جو کو نہیں پہنچ سکتا اور نہ اس کے عشرِ عشیر کو۔‘‘

مقامِ صحابہؓ کی نزاکت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتی ہے کہ امت کو اس بات کا پابند کیا گیا کہ ان کی عیب جوئی کرنے والوں کو نہ صرف ملعون ومردود سمجھیں، بلکہ برملا اس کا اظہار کریں، فرمایا:

’’ إذا رأیتم الذین یسبون أصحابیؓ فقولوا لعنۃ اللّٰہ علٰی شرکم‘‘۔

’’جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو میرے صحابہؓ کو برا بھلا کہتے اور انہیں ہدفِ تنقید بناتے ہیں تو ان سے کہو تم میں سے (یعنی صحابہؓ اور ناقدین صحابہؓ میں سے) جو برا ہے اس پر اللہ کی لعنت (ظاہر ہے کہ صحابہؓ کو برا بھلا کہنے والا ہی بدتر ہوگا)‘‘۔(۱)

حاشیہ (۱): اس اصول کے علاوہ جو مولانا محترم مدفیضہم نے اس حدیث سے مستنبط کیا ہے، اس حدیث پاک کے مفہوم ومنطوق سے کئی اور اہم مسائل بھی مستنبط ہوتے ہیں، مختصراً ان کی طرف اشارہ کردینا مفید ہوگا۔

ا:......حدیث میں ’’سَبَّ‘‘ سے بازاری گالیاں دینا مراد نہیں، بلکہ ہر ایسا تنقیدی کلمہ مراد ہے جو ان حضرات کے استخفاف میں کہا جائے، اس سے معلوم ہوا کہ صحابہؓ پر تنقید اور نکتہ چینی جائز نہیں، بلکہ وہ قائل کے ملعون ومطرود ہونے کی دلیل ہے۔ **(حاشیہ جاری)**

یہاں تمام احادیث کا استیعاب مقصود نہیں، بلکہ کہنا یہ ہے کہ ان قرآنی ونبوی شہادتوں کے بعد بھی اگر کوئی شخص حضراتِ صحابۂ کرامؓ میں عیب نکالنے کی کوشش کرے تو اس بات سے قطع نظر کہ اس کا یہ

(بقیہ حاشیہ) ۲:......آنحضرت ﷺ کے قلبِ اطہر کو اس سے ایذا ہوتی ہے **(وقد صرح به بقوله فمن أذاهم فقد أذاني)** اور آپ ﷺ کے قلبِ اطہر کو ایذا دینے میں حبطِ اعمال کا خطرہ ہے، **لقوله تعالیٰ: ''أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَاتَشْعُرُوْنَ''**۔

۳:......صحابہ کرامؓ کی مدافعت کرنا اور ناقدین کو جواب دینا ملتِ اسلامیہ کا فرض ہے **''فإن الأمر للوجوب''**۔

۴:......آنحضرت ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ ناقدینِ صحابہؓ کو ایک ایک بات کا تفصیلی جواب دیا جائے، کیونکہ اس سے جواب اور جواب الجواب کا ایک غیر مختتم سلسلہ چل نکلے گا، بلکہ یہ تلقین فرمائی کہ انہیں بس اصولی اور فیصلہ کن جواب دیا جائے اور وہ ہے: **''لعنة الله علی شرکم''**۔

۵:......**''شرکم''** اسم تفضیل کا صیغہ ہے جو مشاکلت کے طور پر استعمال ہوا ہے، اس میں آنحضرت ﷺ نے ناقدینِ صحابہؓ کے لیے ایسا کنایہ استعمال فرمایا ہے کہ اگر وہ اس پر غور کریں تو ہمیشہ کے لیے تنقیدِ صحابہؓ کے روگ کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ اتنی بات تو بالکل کھلی ہے کہ صحابہؓ کیسے ہی ہوں، مگر تم سے تو اچھے ہی ہوں گے، تم ہوا پر اُڑلو، آسمان پر پہنچ جاؤ، سو بار مر کر جی لو، مگر تم سے صحابیؓ تو نہیں بنا جاسکے گا، تم آخر وہ آنکھ کہاں سے لاؤ گے جس نے جمالِ جہاں آرائے محمد (ﷺ) کا دیدار کیا؟ وہ کان کہاں سے لاؤ گے جو کلماتِ نبوت سے مشرف ہوئے؟ ہاں وہ دل کہاں سے لاؤ گے جو انفاسِ مسیحائی محمدی سے زندہ ہوئے؟ وہ دماغ کہاں سے لاؤ گے جو انوارِ مقدس سے منور ہوئے؟ تم وہ ہاتھ کہاں سے لاؤ گے جو ایک بار بشرۂ محمدی سے مس ہوئے اور ساری عمر اُن کی بوئے عنبریں نہیں گئی؟ تم وہ پاؤں کہاں سے لاؤ گے جو معیتِ محمدی میں آبلہ پا ہوئے؟ تم وہ زمان کہاں سے لاؤ گے جب آسمان زمین پر اتر آیا تھا؟ تم وہ مکان کہاں سے لاؤ گے جہاں کونین کی سیادت جلوہ آرا تھی؟ تم وہ محفل کہاں سے لاؤ گے جہاں سعادتِ دارین کی شرابِ طہور کے جام بھر بھر دیتے جاتے اور تشنہ کا ''مانِ محبت'' **''هل من مزيد''** کا نعرہ مستانہ لگا رہے تھے؟ تم وہ منظر کہاں سے لاؤ گے جو **''كأني أرى الله عياناً''** کا کیف پیدا کرتا تھا؟ تم وہ مجلس کہاں سے لاؤ گے جہاں **''كأنما على رؤسنا الطير''** کا سماں بندھ جاتا تھا؟ تم وہ صدر نشینِ تختِ رسالت کہاں سے لاؤ گے جس کی طرف **''هذا الأبيض المتكئ''** سے اشارے کئے جاتے تھے؟ تم وہ شمیمِ عنبر کہاں سے لاؤ گے جو دیدارِ محبوب میں خوابِ نیم شبی کو حرام کردیتی تھی؟ تم وہ ایمان کہاں سے لاؤ گے جو ساری دنیا کو تج کر حاصل کیا جاتا تھا؟ تم وہ اعمال کہاں سے لاؤ گے جو پیمانۂ نبوت سے ناپ ناپ کر ادا کیے جاتے تھے؟ تم وہ اخلاق کہاں سے لاؤ گے جو آئینۂ محمدی سامنے رکھ کر سنوارے جاتے تھے؟ تم وہ رنگ کہاں سے لاؤ گے جو **''صبغة الله''** کی بھٹی میں دیا جاتا تھا؟ تم وہ ادائیں کہاں سے لاؤ گے جو دیکھنے والوں کو نیم بسمل بنادیتی تھیں؟ تم وہ نماز کہاں سے لاؤ گے جس کے امام نبیوں کے امام تھے؟ تم قدوسیوں کی وہ جماعت کیسے بن سکو گے جس کے سردار رسولوں کے سردار تھے؟

تم میرے صحابہؓ کو لاکھ برا کہو، مگر اپنے ضمیر کا دامن جھنجھوڑ کر بتاؤ! اگر ان تمام سعادتوں کے بعد بھی میرے صحابہؓ برے ہیں تو کیا تم ان سے بدتر نہیں ہو؟ اگر وہ تنقید وملامت کے مستحق ہیں تو کیا تم لعنت وغضب کے مستحق نہیں ہو؟ اگر تم میرے صحابہؓ کو بدنام کرتے ہو تو کیا میرا خدا تمہیں سرِ محشر سب کے سامنے رسوا نہیں کرے گا؟ اگر تم میں انصاف وحیا کی کوئی رمق باقی ہے تو اپنے گریبان میں جھانکو اور میرے صحابہؓ کے بارے میں زبان بند کرو اور اگر تمہارا ضمیر بالکل مسخ ہوچکا ہے تو بھری دنیا یہ فیصلہ کرے گی کہ میرے صحابہؓ پر تنقید کا حق ان کپوتوں کو حاصل ہونا چاہیے؟ **(حاشیہ جاری)**

طرزِ عمل قرآنِ کریم کی نصوصِ قطعیہ اور ارشاداتِ نبوت کے انکار کے مترادف ہے، یہ لازم آئے گا کہ حق تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ پر جو فرائض بحیثیتِ منصب نبوت کے عائد کیے تھے اور جن میں اعلیٰ ترین منصب تزکیۂ نفوس کا تھا، گویا حضرت رسالتِ پناہ ﷺ اپنے فرضِ منصبی کی بجا آوری سے قاصر رہے اور تزکیہ نہ کر سکے اور یہ قرآن کریم کی صریح تکذیب ہے، حق تعالیٰ تو ان کے تزکیہ کی تعریف فرمائے اور ہم انہیں مجروح کرنے میں مصروف رہیں۔

اور جب نبی کریم ﷺ ان کے تزکیہ سے قاصر رہے تو گویا حق تعالیٰ نے آپ کا انتخاب صحیح

(بقیہ حاشیہ) علامہ طیبیؒ نے اسی حدیث کی شرح میں حضرت حسانؓ کا ایک عجیب شعر نقل کیا ہے:

أتهجوه ولست له بكفوء

فشركما لخيركما فداء

ترجمہ: ''کیا تو آپ (ﷺ) کی ہجو کرتا ہے جب کہ تو آپ (ﷺ) کے برابر کا نہیں ہے؟ پس تم دونوں میں بدتر تمہارے بہتر پر قربان''۔

۶:......حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تنقیدِ صحابہؓ کا منشأ ناقد کا نفسیاتی شر اور خبث وتکبر ہے، آپ جب کسی شخص کے طرزِ عمل پر تنقید کرتے ہیں تو اس کا منشأ یہ ہوتا ہے کہ کسی صفت میں وہ آپ کے نزدیک خود آپ کی اپنی ذات سے فروتر اور گھٹیا ہے، جب کوئی شخص کسی صحابیؓ کے بارے میں مثلاً یہ کہے گا کہ اس نے عدل وانصاف کے تقاضوں کو کماحقہٗ ادا نہیں کیا تھا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اگر اس صحابیؓ کی جگہ یہ صاحب ہوتے تو عدل وانصاف کے تقاضوں کو زیادہ بہتر ادا کرتے، گویا ان میں صحابیؓ سے بڑھ کر صفتِ عدل موجود ہے، یہ ہے تکبر کا وہ ''شر'' اور نفس کا وہ ''خبث'' جو تنقید صحابہؓ پر ابھارتا ہے اور آنحضرت ﷺ اسی ''شر'' کی اصلاح اس حدیث میں فرمانا چاہتے ہیں۔

۷:......حدیث میں بحث ومجادلہ کا ادب بھی بتایا گیا ہے، یعنی خصم کو براہِ راست خطاب کرتے ہوئے یہ نہ کہا جائے کہ: تم پر لعنت! بلکہ یوں کہا جائے کہ تم دونوں میں جو برا ہو اس پر لعنت! ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسی منصفانہ بات ہے جس پر سب کو متفق ہونا چاہیے، اس میں کسی کے برہم ہونے کی گنجائش نہیں، اب رہا یہ قصہ کہ ''تم دونوں میں برا'' کا مصداق کون ہے؟ خود ناقد؟ یا جس پر وہ تنقید کرتا ہے؟ اس کا فیصلہ کوئی مشکل نہیں، دونوں کے مجموعی حالات سامنے رکھ کر ہر معمولی عقل کا آدمی یہ نتیجہ آسانی سے نکال سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا صحابیؓ برا ہو سکتا ہے یا اس کا خوش فہم ناقد؟

۸:......حدیث میں ''فقولوا'' کا خطاب امت سے ہے، گویا ناقدین صحابہؓ کو آنحضرت ﷺ اپنی امت نہیں سمجھتے، بلکہ انہیں امت کے مقابل فریق کی حیثیت سے کھڑا کرتے ہیں اور یہ ناقدین کے لیے شدید وعید ہے، جیسا کہ بعض دوسرے معاصی پر ''فلیس منا'' کی وعید سنائی گئی ہے۔

۹:......حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ کو جس طرح ناموسِ شریعت کا اہتمام تھا، اسی طرح ناموسِ صحابہؓ کی حفاظت کا بھی اہتمام تھا، کیونکہ ان ہی پر سارے دین کا مدار ہے۔

۱۰:......حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ناقدینِ صحابہؓ کی جماعت بھی ان ''مارقین'' سے ہے جن سے جہاد باللسان کا حکم امت کو دیا گیا ہے، یہ مضمون کئی احادیث میں صراحۃً بھی آرہا ہے، واللہ اعلم بالصواب۔ انتہیٰ (مدیر)

نہیں فرمایا تھا، إنا للّٰہ ۔ بات کہاں سے کہاں تک پہنچ جاتی ہے اور جب اللہ تعالیٰ کے انتخاب میں قصور نکلا تو اللہ تعالیٰ کا علم غلط ہوا، **نعوذ باللّٰہ من الغوایة والسفاهة** ۔ چنانچہ اہل ہوا کی بڑی جماعت کا دعویٰ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ''**بدأ**'' ہوتا ہے، یعنی اسے بہت سی چیزیں جو پہلے معلوم نہیں تھیں بعد میں معلوم ہوتی ہیں اور اس کا پہلا علم غلط ہو جاتا ہے، جن لوگوں کا اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ تصور ہو، رسول اور نبی ﷺ اور ان کے بعد صحابہ کرامؓ کا ان کے نزدیک کیا درجہ رہے گا......؟

الغرض صحابہ کرامؓ پر تنقید کرنے، ان کی غلطیوں کو اچھالنے اور انہیں موردِ الزام بنانے کا قصہ صرف ان ہی تک محدود نہیں رہتا، بلکہ خدا اور رسول، کتاب وسنت اور پورا دین اس کی لپیٹ میں آجاتا ہے اور دین کی ساری عمارت منہدم ہو جاتی ہے، بعید نہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے اس ارشاد میں جو اوپر نقل کیا گیا ہے، اسی بات کی طرف اشارہ فرمایا ہو:

''من أذاهم فقد أذانی ومن أذانی فقد أذی اللّٰه، ومن أذی اللّٰه فیوشک أن یأخذه''۔

''جس نے ان کو ایذا دی اس نے مجھے ایذا دی اور جس نے مجھے ایذا دی اس نے اللہ تعالیٰ کو ایذا دی اور جس نے اللہ کو ایذا دی تو قریب ہے کہ اللہ اسے پکڑ لے''۔

اور یہی وجہ ہے کہ تمام فرقِ باطلہ کے مقابلہ میں اہل حق کا امتیازی نشان صحابہ کرامؓ کی عظمت ومحبت رہا ہے، تمام اہل حق نے اپنے عقائد میں اس بات کو اجماعی طور پر شامل کیا ہے کہ:

''ونکف عن ذکر الصحابةؓ إلا بخیر''۔

''اور ہم صحابہؓ کا ذکر بھلائی کے سوا کسی اور طرح کرنے سے زبان بند رکھیں گے''۔

گویا اہل حق اور اہل باطل کے درمیان امتیاز کا معیار صحابہ کرامؓ کا ''ذکر بالخیر'' ہے۔ جو شخص ان حضرات کی غلطیاں چھانٹتا ہو، ان کو موردِ الزام قرار دیتا ہو، اور ان پر سنگین اتہامات کی فردِ جرم عائد کرتا ہو، وہ اہل حق میں شامل نہیں ہے۔

جو حضرات اپنے خیال میں بڑی نیک نیتی، اخلاص اور بقول ان کے وقت کے اہم ترین تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے قبائح صحابہؓ کو ایک مرتب فلسفہ کی شکل میں پیش کرتے ہیں اور اسے ''تحقیق'' کا نام دیتے ہیں، انہیں اس کا احساس ہو یا نہ ہو، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس تسویدِ اوراق کا انجام اس کے سوا کچھ نہیں کہ جدید نسل کو دین کے نام پر دین سے بیزار کر دیا جائے اور ہر ایرے غیرے کو صحابہ کرامؓ پر تنقید کی کھلی چھٹی دے دی جائے، جنہیں نہ علم ہے نہ عقل، نہ فہم ہے نہ فراست۔ اور یہ نرا اندیشہ ہی اندیشہ نہیں، بلکہ کھلی آنکھوں اس کا مشاہدہ ہونے لگا ہے، **الأمان والحفیظ**۔

کہا جاتا ہے کہ: ''ہم نے کوئی نئی بات نہیں کہی، بلکہ تاریخ کی کتابوں میں یہ سارا مواد موجود

تھا۔ ہمارا قصور صرف یہ ہے کہ ہم نے اُسے جمع کردیا ہے۔‘‘ افسوس ہے کہ یہ عذر پیش کرتے ہوئے بہت سی اصولی اور بنیادی باتوں کو نظر انداز کردیا گیا ہے، ورنہ بادنیٰ تأمل واضح ہوجاتا کہ صرف اتنا عذر طعنِ صحابہؓ کی وعید سے بچنے کے لیے کافی نہیں، اور نہ وہ اتنی بات کہہ کر بری الذمہ ہوسکتے ہیں۔

اولاً: قرآن کریم کی نصوصِ قطعیہ، احادیث ثابتہ اور اہل حق کا اجماع‘ صحابہؓ کی عیب چینی کی ممانعت پر متفق ہیں، ان قطعیات کے مقابلہ میں ان تاریخی قصہ کہانیوں کا سرے سے کوئی وزن ہی نہیں۔ تاریخ کا موضوع ہی ایسا ہے کہ اس میں تمام رطب ویابس اور صحیح وسقیم چیزیں جمع کی جاتی ہیں، صحت کا جو معیار ’’حدیث‘‘ میں قائم رکھا گیا ہے، تاریخ میں وہ معیار نہ قائم رہ سکتا تھا، نہ اُسے قائم رکھنے کی کوشش کی گئی ہے، اس لیے حضراتِ محدثین نے ان کی صحت کی ذمہ داری اٹھانے سے انکار کردیا ہے۔

حافظ عراقیؒ فرماتے ہیں:

’’ولیعلم الطالب أن السیر یجمع ماقد صح وما قد أنکرا‘‘۔

’’یعنی علم تاریخ وسیر صحیح اور منکر سب کو جمع کرلیتا ہے‘‘۔

اب جو شخص کسی خاص مدعا کو ثابت کرنے کے لیے تاریخی مواد کو کھنگال کر تاریخی روایات سے استدلال کرنا چاہتا ہے، اُسے عقل وشرع کے تمام تقاضوں کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف یہ دیکھ لینا کافی نہیں ہے کہ یہ روایت فلاں فلاں تاریخ میں لکھی ہے، بلکہ جس طرح وہ یہ سوچتا ہے کہ یہ روایت اس کے مقصد ومدعا کے لیے مفید ہے یا نہیں؟ اسی طرح اسے اس پر بھی غور کرلینا چاہیے کہ کیا یہ روایت شریعت یا عقل سے متصادم تو نہیں؟ اس اصول کی وضاحت کے لیے یہاں صرف ایک مثال کا پیش کرنا کافی ہوگا:

آپ ’’خلیفہ راشد‘‘ اسے کہتے ہیں جو ٹھیک منہاجِ نبوت پر قائم ہو اور اس کا کوئی عمل اور کوئی فیصلہ منہاجِ نبوت کے اعلیٰ معیار سے ہٹا ہوا نہ ہو، اب آپ ایک صحابیؓ کو خلیفہ راشد تسلیم کرتے ہوئے اس پر یہ الزام عائد کرتے کہ انہوں نے بلاکسی استحقاق کے مالِ غنیمت کا پورا خمس (۵ لاکھ دینار) اپنے فلاں رشتہ دار کو بخش دیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ ’’خلافت راشدہ‘‘ اور منہاجِ نبوت یہی ہے جس کی تصویر اس افسانے میں دکھائی گئی ہے؟ اور آج کے ماحول میں اس روایت کو من وعن تسلیم کرنے سے کیا یہ ذہن نہیں بنے گا کہ خلافتِ راشدہ کا معیار بھی آج کے جائز حکمرانوں سے کچھ زیادہ بلند نہیں ہوگا جو اپنے رشتہ داروں کو روٹ پرمٹ اور امپورٹ لائسنس مرحمت فرماتے ہیں؟ اسی پر ان دوسرے الزامات کو قیاس کرلیجئے جو بڑی شانِ تحقیق سے عائد کیے گئے ہیں۔

ثانیاً: یہ تاریخی روایات آج یکایک نہیں ابھر آئی ہیں، بلکہ اکابر اہلِ حق کے سامنے یہ سارا کچھ موجود رہا ہے اور وہ اس کی مناسب تاویل وتوجیہ کرچکے ہیں، جس سے معلوم ہوا کہ ان تاریخی واقعات کو بڑی آسانی سے کسی اچھے محمل پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ اب ایک شخص اٹھتا ہے اور

’’بے لاگ تحقیق‘‘ کے شوق میں ان کے ایسے محمل تلاش کرتا ہے جس سے صحابہ کرامؓ کی صریح تنقیص اوران کی سیرت وکردار کی گراوٹ مفہوم ہوتی ہے، کیا اس کے بارے میں یہ حسن ظن رکھا جائے کہ صحابہ کرامؓ کے بارے میں وہ ’’حسن ظن‘‘ رکھتا ہے؟

اور عجیب بات یہ کہ جب اس کے سامنے اکابر اہل حق کے طرزِ تحقیق کا حوالہ دیا جاتا ہے تو ان حضرات کو ’’وکیل صفائی‘‘ کہہ کر ان کی تحقیقات کو قابلِ التفات نہیں سمجھتا، غالباً یہ دنیا کی نرالی عدالت ہے جس میں ’’وکیل استغاثہ‘‘ کے بیان پر یک طرفہ فیصلہ دیا جائے اور ’’وکیل صفائی‘‘ کے بیانات کو اس جرم میں نظرانداز کر دیا جائے کہ وہ کسی مظلوم کی طرف سے صفائی کا وکیل بن کر کیوں کھڑا ہو گیا ہے؟ ۔اوپر قرآن وسنت کی جن نصوص کا حوالہ دیا گیا اور اہل حق کے جس اجماعی فیصلہ کا ذکر کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوگا کہ صرف حافظ ابن تیمیہؒ اور شاہ عبدالعزیزؒ ہی نہیں، بلکہ خدا اور رسول اور پوری امت کے اہل حق، صحابہ کرامؓ کے ’’وکیل صفائی‘‘ ہیں ۔اب یہ فیصلہ کرنا ہر شخص کی اپنی صوابدید پر موقوف ہے کہ وہ وکیل صفائی کی صف میں شامل ہونا پسند کرتا ہے یا وکیل استغاثہ کی صف میں ۔

ثالثاً: ان تاریخی روایات کے متفرق جزئی واقعات کو چن چن کر جمع کرنا، انہیں ایک مربوط فلسفہ بنا ڈالنا، جزئیات سے کلیات اخذ کر لینا اور ان پر ایسے جلی اور چبھتے ہوئے عنوانات جمانا، جنہیں آج کی چودھویں صدی کا فاسق سے فاسق بھی اپنی طرف منسوب کرنا پسند نہیں کرے گا، یہ نہ تو دین وملت کی کوئی خدمت ہے، نہ اسے اسلامی تاریخ کا صحیح مطالعہ کہا جا سکتا ہے، البتہ اسے ’’تاریخ سازی‘‘ کہنا بجا ہوگا ۔بقول سعدیؒ ع

’’ ولیکن قلم در کفِ دشمن است ‘‘

میں پوچھتا ہوں، کیا کوئی ادنیٰ مسلمان اپنے بارے میں یہ سننا پسند کرے گا کہ اس نے خدائی دستور کو بدل ڈالا؟ اس نے بیت المال کو گھر کی لونڈی بنا لیا؟ اس نے مسلمانوں سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی آزادی سلب کر لی؟ اس نے عدل وانصاف کی مٹی پلید کر ڈالی؟ اس نے دیدہ ودانستہ نصوصِ قطعیہ سے سرتابی کی؟ اس نے خدائی قانون کی بالادستی کا خاتمہ کر ڈالا؟ اس نے اقربا پروری وخویش نوازی کے ذریعہ لوگوں کی حق تلفی کی؟

کیا کوئی معمولی قسم کا متقی اور پرہیزگار آدمی ان جگر پاش اتہامات کو ٹھنڈے دل سے برداشت کرے گا؟ اگر نہیں...... اور یقیناً نہیں...... تو کیا صحابہ کرامؓ ہم نالائقوں سے بھی گئے گزرے ہو گئے؟ کہ ایک دو نہیں، بلکہ مثالب وقبائح اور اخلاقی گراوٹ کی ایک طویل فہرست ان کے نام جڑ دی جائے، پھر بے لاگ تحقیق کے نام سے اسے اچھالا جائے اور روکنے اور ٹوکنے کے باوجود اس پر اصرار کیا جائے ۔

کیا صحابہ کرامؓ کی عزت وحرمت یہی ہے؟ کیا اسی کا نام صحابہؓ کا ’’ذکر بالخیر‘‘ ہے؟

کیا رسول اللہ ﷺ کے معزز صحابہؓ اسی احترام کے مستحق ہیں؟ کیا ایمانی غیرت کا یہی تقاضا ہے؟ کیا مسلمانوں کو رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد بھول جانا چاہیے؟

''جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو میرے صحابہؓ کو برا بھلا کہتے ہیں تو ان کے جواب میں یہ کہو: تم میں سے (یعنی صحابہ کرامؓ اور ان کے ناقدین میں سے) جو برا ہو اس پر اللہ کی لعنت!'' (ترمذی)

آنحضرت ﷺ کے صحابہؓ 'بعد کی امت کے لیے حق و باطل کا معیار ہیں، اُنہیں معیتِ نبوی کا جو شرف حاصل ہوا، اس کے مقابلہ میں کوئی بڑی سے بڑی فضیلت ایک جَو کے برابر بھی نہیں، کسی بڑے سے بڑے ولی اور قطب کو ان کی خاکِ پا بننے کا شرف حاصل ہو جائے تو اس کے لیے مایۂ صد افتخار ہے، اس لیے امت کے کسی فرد کا ...... خواہ وہ اپنی جگہ مفکرِ دوران اور علامۂ زماں ہی کہلواتا ہو ...... ان پر تنقید کرنا قلبی زیغ کی علامت ہے:

ایاز! قدرِ خویش بشناس!!

یہ دنیا حق و باطل کی آماجگاہ ہے، یہاں باطل' حق کا لبادہ اوڑھ کر آتا ہے۔ بسا اوقات ایک آدمی اپنے غلط نظریات کو صحیح سمجھ کر ان سے چمٹا رہتا ہے، جس سے رفتہ رفتہ اس کے ذہن میں کجی آجاتی ہے اور بالآخر اس سے صحیح کو صحیح اور غلط کو غلط سمجھنے کی استعداد ہی سلب ہو جاتی ہے اور یہ بڑی خطرناک بات ہے۔ اہل حق و تحقیق کی یہ شان نہیں کہ وہ ...... ''میں یہ سمجھتا ہوں'' ...... کی برخود غلط فہمی میں مبتلا ہوں اور جب انہیں اخلاص و خیر خواہی سے تنبیہ کی جائے تو تاویلات کا ''ضمیمہ'' لگانے بیٹھ جائیں۔ اہل حق کی شان تو یہ ہے کہ اگر ان کے قلم و زبان سے کوئی نامناسب لفظ نکل جائے تو تنبیہ کے بعد فوراً حق کی طرف پلٹ آئیں۔

حق تعالیٰ جل ذکرہٗ ہمیں اور ہمارے تمام مسلمان بھائیوں کو ہر زیغ و ضلال سے محفوظ فرمائے، اور اتباعِ حق کی توفیق بخشے۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَةً إِنَّکَ أَنْتَ الْوَهَّابُ

وصلی اللّٰہ تعالٰی علٰی خیر خلقہٖ صفوۃ البریۃ محمدٍ وعلٰی آلہٖ وأصحابہٖ وأتباعہٖ أجمعین، آمین.

مسجدِ اقصیٰ کی تولیت اور عمار خان ناصر صاحب کی تحریرات

مولانا سمیع اللہ سعدی

(تفصیلی وتنقیدی جائزہ) (تیسری قسط)

آنجناب کے ’’اعتراضات‘‘

۱:......آنجناب نے اس پر ایک تو وہی ’’صراحت‘‘ والا ’’پرانا‘‘ اعتراض کیا، لیکن ظاہر ہے کہ جب اس واقعے کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے اس امت کو خیر امت کا لقب دیا، تو اس حکمت کی طرف ایک اعتبار سے ’’صریح‘‘ اشارہ ہوگیا۔ ذوق والوں پر اس کی ’’صراحت‘‘ مخفی نہیں ہے۔

۲:......آنجناب نے ایک ’’عجیب‘‘ اعتراض یہ بھی کیا ہے کہ اگر اس واقعے سے مسجدِ اقصیٰ کی تولیت امتِ مسلمہ کے پاس آگئی تو ان کی تالیف کا مقصد کیونکر حاصل ہوگا؟ کیونکہ اس سے تو آنجناب کے بقول اُنہیں اشتعال میں آنا چاہیے کہ ان کا قبلہ ان سے چھین لیا گیا۔ گویا آنجناب کے نزدیک اس واقعے سے تولیت کی منسوخی اور یہود کی تالیفِ قلب دونوں اخذ کرنا ایک قسم کا تعارض ہے، لیکن آنجناب کو یہ تضاد دو وجہ سے پیش آرہا ہے:

پہلی وجہ: آنجناب تحویلِ قبلہ کے اس واقعے کو تولیت کا ’’باقاعدہ اعلان‘‘ بنارہے ہیں، حالانکہ ہم کئی بار کہہ چکے ہیں کہ یہ باقاعدہ اعلانات اور دلائل نہیں ہیں، بلکہ یہ توحقِ تولیت کے مظاہر ہیں۔ حقِ تولیت کی اصل دلیل تو اللہ تعالیٰ کا وہ ضابطہ اور خاص ’’سنت‘‘ ہے، جو ان مقاماتِ مقدسہ کے بارے میں تمام ادیانِ سماویہ میں مسلم ہے۔ نیز یہ سنت ’’قولی اعلانات‘‘ کی بجائے عام طور پر ’’فعلی‘‘ شکل میں ظاہر ہوتی ہے، (اگرچہ کتبِ سماویہ میں اس ضابطے کا اعلان بھی مختلف مواقع پر کیا گیا، جیسے ہم ماقبل میں تورات اور قرآن پاک کے حوالے سے دونوں مقدس مقامات کے بارے میں اس ’’سنت‘‘ کا ذکر کر چکے ہیں) یعنی کہ ان مقدس مقامات پر اللہ تعالیٰ اہلِ حق کو غلبہ دے دیتے ہیں۔ چنانچہ مسجدِ حرام پر اللہ تعالیٰ نے اس امت کو فتحِ مکہ کی شکل میں تولیت عطا کی، حالانکہ آنجناب کا ’’مفروضہ اعلان‘‘ تو ایک سال بعد ۹ھ میں کیا گیا، جبکہ مسجدِ اقصیٰ پر تولیت کی آپ ﷺ نے باقاعدہ خوشخبری دی اور یہ خوشخبری حضرت عمرؓ

کے ہاتھوں پوری ہوئی اوران کے دور میں اس مقدس مقام کی تولیت بھی اس امت کے پاس آ گئی۔

دوسری وجہ: آنجناب نے یہاں اس حکم کی مختلف گروہوں کے اعتبار سے مختلف حیثیتوں کو ''خلط'' کردیا،اس لیے آنجناب کو تضاد نظر آیا۔گویا حیثیت کی قید کونظرانداز کرنے کی وجہ سے آنجناب کو تعارض نظر آیا۔اس حکم کی حیثیت یہودیوں کے اعتبار سے تالیفِ قلب تھی ،منافقین اور کمزور ایمان والوں کے اعتبار سے ابتلاء وآزمائش کی تھی اور پختہ اورحقیقی ایمان کے حامل آپ ﷺ کے سچے متبعین کے اعتبار سے اُنہیں اس مقدس گھر کا ذمہ دار بنا کرانہیں خیر امت کے منصب پر فائز کرنا تھا (اگر چہ اس کا ظہور کئی سال بعد حضرت عمرؓ کے دور میں ہوا) اس کی مثال بالکل یوں ہے کہ قرآن پاک کی حیثیت مومنین کے اعتبار سے ذریعۂ رحمت ہے اور کفار کے اعتبار سے ذریعۂ ضلالت ہے،جیسا کہ خود قرآن پاک نے اپنی یہ مختلف حیثیات بیان کی ہیں (۱) تو آنجناب اس ''تعارض'' کے بارے میں کیا کہیں گے؟ یہی وجہ ہے کہ یہ تضاد چودہ سو سالہ تاریخ میں صرف آنجناب کونظر آیا۔سلف سے اعراض کر کے،صرف عقل اور محض عقل کو بنیاد بنا کرشرعی نصوص کی تفسیر کرنے سے ایسے تضادات پیش آجایا کرتے ہیں۔

۳:......آنجناب نے یہود کے حقِ تولیت کے باقی رہنے میں اس سے بھی ''استدلال'' کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خودقرآن پاک میں ''قِبْـلَتَهُـمْ'' کا لفظ کہہ کرگویا یہود کے اس مقدس مقام پرتولیت کی ''توثیق'' کردی، کیونکہ آنجناب کے بقول تنسیخ تولیت کے مبحث میں یہ نسبت موزوں معلوم نہیں ہوتی۔

اس ''شاہکار استنباط'' پرہم صرف اتنا کہتے ہیں کہ آنجناب صرف اس سوال کا جواب دیں کہ اگر مسجدِ اقصیٰ کو یہود کا صرف قبلہ ''کہنا'' (وہ بھی ان کے زعم کے مطابق) ان کے حقِ تولیت کے باقی رہنے کی ''دلیل'' ہے،تو مسلمانوں کے لیے تو اللہ تعالیٰ نے اس مقام کو باقاعدہ شرعی حکم کے تحت قبلہ ڈیڑھ سال تک ''بنایا'' کیا یہ مسلمانوں کے حقِ تولیت کے لیے مؤید نہیں ہے؟ تعجب ہے کہ ایک فریق کے لیے صرف قبلہ ''کہنے'' سے تو حقِ تولیت ثابت ہوتی ہو اور دوسرے فریق کے لیے اسے باقاعدہ قبلہ ''بنانے'' سے ان کے حقِ تولیت کا اشارہ تک نہ بنتا ہو؟ چنانچہ آنجناب لکھتے ہیں:

> ''ہم فی الواقع نہیں سمجھ سکے کہ اس پس منظر کے ساتھ مسجدِ اقصیٰ کو عارضی طور پر مسلمانوں کا قبلہ مقرر کرنے کے اس حکم کو دلالت کی کونسی قسم کے تحت مستقل تولیت کا پروانہ قرار دیا جاسکتا ہے؟''۔

ہم بھی ''بجوابِ آں غزل'' کہتے ہیں:

> ''ہم فی الواقع نہیں سمجھ سکے کہ اس پسِ منظر کے ساتھ مسجدِ اقصیٰ کوصرف یہود کا قبلہ کہنے سے دلالت کی کونسی قسم کے تحت اس مغضوبِ علیہم قوم کو اللہ کا یہ مقدس و مطہر گھر مستقل طور پر دینے کا پروانہ قرار دیا جاسکتا ہے؟''۔

مشرکینِ مکہ پر قیاس

جناب عمار صاحب نے حقِ تولیت کے ''مزعومہ شرعی دلائل'' کا ذکر کرتے ہوئے تیسرے نمبر پر یہ ''دلیل'' ذکر کی ہے اور یہ ''دعویٰ'' کیا ہے کہ مسلم مفکرین یہود کی تولیت کی منسوخی کے لیے مسجدِ اقصیٰ کو مسجدِ حرام پر اور یہود کو مشرکینِ مکہ پر ''قیاس'' کرتے ہیں کہ جس طرح مشرکین مکہ اللہ کی نافرمانی کے نتیجے میں مسجدِ حرام کی تولیت سے محروم کیے گئے، اسی طرح یہود بھی اپنی نافرمانیوں کی بدولت مسجدِ اقصیٰ کی تولیت سے محروم ہوں گے۔

آنجناب نے یہ استدلال حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ کی مایہ ناز کتاب ''مقاماتِ مقدسہ اور ان کا اجتماعی نظام'' کے ایک اقتباس سے اخذ کیا ہے، ہم سب سے پہلے حضرت قاری صاحبؒ کی وہ عبارت قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں، پھر آنجناب کے ''حسنِ استنباط'' سے متعلق چند باتیں عرض کریں گے۔ حضرت قاری صاحبؒ لکھتے ہیں:

> ''یہ **تینوں مرکز** اسلام کی جامعیت کی وجہ سے مسلمانوں کو کسی کے دیے سے نہیں ملے، بلکہ خدا کی طرف سے عطا ہوئے اور انہی کے قبضہ وتصرف میں دیے گئے ہیں، جن میں کسی غیر کے دخل یا قبضے کا **از روئے اصول** سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حجاز میں مشرکین ملتِ ابراہیم کے نام سے عرب پر قابض ومتصرف تھے، لیکن جب انہوں نے شعائر اللہ کی جگہ بے جان مورتیوں اور پتھر کے سنگ دل خداؤں کو جگہ دی، **تو سنت اللہ کے مطابق ان کا قبضہ تبدیل کر دیا گیا**۔ شام کی مقدس سرزمین بلا شبہ اولاً یہود کو دی گئی اور فلسطین ان کے قبضے میں لگا دیا گیا، جیسا کہ قرآن ''کَتَبَ اللّٰہُ لَکُمْ'' سے اس کا اُنہیں دے دیا جانا ظاہر کیا ہے، لیکن انہوں نے عہد شکنی کی اور الٰہی میثاق کو توڑ ڈالا۔ **ان حرکات کے انتہا کو پہنچ جانے پر حق تعالیٰ نے انہیں بیت المقدس کی تولیت اور اس ملک کی ملکیت سے محروم کر کے ان پر نصاریٰ کو مسلط کر دیا**، چنانچہ بعثتِ نبوی سے تین سو سال پہلے نصاریٰ، شام اور فلسطین کی ارضِ مقدس پر قابض ہو گئے، لیکن اقتدار جم جانے کے بعد ردِ عمل شروع ہوا اور بالآخر وہ بھی قومی اور طبقاتی رقابتوں میں مبتلا ہو کر اسی راہ پر چل پڑے تھے جس پر یہود چلے تھے، صخرۂ معلقہ کو جو یہود کا قبلہ تھا، غلاظت کی جگہ قرار دیا اور اس کی انتہائی توہین شروع کر دی، محض اس لیے کہ وہ یہود کا قبلہ تھا، اس پر پلیدی ڈالی اور اسے مزبلہ (کوڑی) بنا کر چھوڑا۔ **ظاہر ہے کہ شعائرِ الٰہیہ اور نشاناتِ خداوندی کے بعد کوئی قوم بھی پنپ نہیں سکتی**، اس لیے بالآخر نصاریٰ کا بھی وقت آ گیا، ان کا اقتدار یہاں ختم ہوا اور **حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو غلبہ دے**

کر اُنہیں بیت المقدس کا متولی بنایا۔'' (بحوالہ مذکورہ مضمون)

آنجناب نے اس عبارت سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے:

''اس میں اہلِ کتاب کو مشرکین مکہ پر اور اس کے نتیجے میں مسجدِ اقصیٰ کی تولیت کے معاملے کو مسجدِ حرام کی تولیت کے معاملے پر قیاس کیا گیا ہے''۔

قارئین سے درخواست ہے کہ وہ حضرت قاری صاحبؒ کی عبارت کو دوبارہ غور سے پڑھیں اور خصوصاً تحریر میں نمایاں کردہ جملوں اور الفاظ کو توجہ سے دیکھیں، پھر جناب عمار صاحب کے اخذ کردہ نتیجے کو دیکھیں اور انصاف سے فیصلہ کریں کہ کیا واقعی حضرت کا مقصد ایک ''عقلی قیاس'' پیش کرنا ہے؟ جیسا کہ آنجناب نے ''دعویٰ'' کیا ہے یا حضرت قاری صاحب اس عبارت میں اس ''سنت اللہ'' اور ''خداوندی ضابطے'' کو بیان کرنا چاہتے ہیں، جس کو ہم نے اس تحریر میں بار بار بیان کیا ہے؟

حضرتؒ نے اس عبارت میں سب سے پہلے ان عبادت گاہوں کے لیے ''مرکز'' کا لفظ استعمال کیا، اس سے اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ جن مقامات کی ہم بات کر رہے ہیں، وہ کسی مخصوص قوم، ملت اور مذہب کی ''جاگیر'' نہیں، بلکہ یہ مقامات اللہ کے منتخب کردہ مراکز ہیں۔ اس سے آنجناب کے اس نظریے کی تردید ہوگئی کہ مسجدِ اقصیٰ کی حیثیت محض بنی اسرائیل کے قومی قبلہ اور مرکزِ عبادت کی ہے، چنانچہ آنجناب لکھتے ہیں:

''اس کے برعکس مسجدِ اقصیٰ کی حیثیت محض بنی اسرائیل کے قومی قبلہ اور مرکزِ عبادت کی تھی''۔

اس کے بعد حضرت قاری صاحبؒ نے مشرکین کے حقِ تولیت کے ختم ہونے کو یوں بیان کیا:

''تو سنت اللہ کے مطابق ان کا قبضہ تبدیل کیا گیا''۔

کیا جناب عمار صاحب بتائیں گے کہ ''سنت اللہ'' سے کیا مراد ہے؟ اور حضرت اس لفظ سے ان مراکز عبادت کے لیے اللہ کی کونسی ''سنت'' اور ''ضابطے'' کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں؟

پھر حضرت قاری صاحبؒ نے مسجدِ اقصیٰ کی تولیت یہود سے نصاریٰ کی طرف منتقل ہونے کو یوں بیان کیا:

''انہوں نے عہد شکنی کی اور الٰہی میثاق کو توڑ ڈالا، ان حرکات کے انتہا کو پہنچ جانے کی بنا پر حق تعالیٰ نے انہیں بیت المقدس کی تولیت اور اس ملک کی ملکیت سے محروم کر دیا''۔

اس عبارت میں حضرت قاری صاحبؒ نے پھر اس ''سنت اللہ'' کی طرف اشارہ کیا کہ اللہ تعالیٰ نے خود اُنہیں ان کی مذکورہ حرکات کی بنا پر مسجدِ اقصیٰ کی تولیت سے محروم کر دیا۔

اس کے بعد اس مقدس مقام کی تولیت مسلمانوں کی طرف منتقل ہونے کو کچھ یوں بیان کیا:

''ظاہر ہے کہ شعائر الٰہیہ اور نشاناتِ خداوندی کے بعد کوئی قوم بھی پنپ نہیں سکتی، اس لیے بالآخر نصاریٰ کا وقت آ گیا، ان کا اقتدار ختم ہوا اور حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو غلبہ دے کر انہیں بیت المقدس کا متولی بنا دیا۔''

اس پوری عبارت کا تجزیہ کرنے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت قاری صاحبؒ مسجدِ اقصیٰ

اور مسجدِ حرام دونوں کو شعائر اللہ، نشاناتِ خداوندی، مراکزِ عبادت اور مقدس مقام مانتے ہیں۔ پھر ان مقاماتِ مقدسہ کے بارے میں اس ''سنت اللہ'' اور ''خدائی ضابطے'' کو بیان کیا، جس کی طرف ہم کئی بار اس تحریر میں اشارہ کر چکے ہیں، چنانچہ حضرت قاری صاحبؒ مشرکین سے بیت اللہ کی تولیت چھیننے، یہود کے مسجدِ اقصیٰ کی تولیت سے محروم ہونے، نصاریٰ کے مسجدِ اقصیٰ کی تولیت سے معزولی اور آخر میں مسلمانوں کا ان مقدس مقامات کی تولیت سنبھالنے کو ''سنت اللہ'' اور اسی ''خداوندی ضابطے'' کا نتیجہ قرار دے رہے ہیں۔ لیکن آنجناب کا ''حسنِ استنباط'' ہے کہ اس عبارت سے ایک ''عقلی قیاس'' ثابت کر رہے ہیں۔

اس کے بعد آنجناب نے اپنے ''غلط نتیجے'' کی بنیاد پر بحث کی پوری عمارت کھڑی کر دی اور اس ''مزعومہ قیاس'' کے رد میں درج ذیل نکات اٹھائے:

نکتہ نمبر:۱......حق تولیت کے لیے ''صریح دلیل'' کی ضرورت ہے، اُسے صرف قیاس سے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

نکتہ نمبر:۲......مشرکینِ مکہ اور اہلِ کتاب کے جرائم، احکامات اور ان دو مسجدوں کی نوعیت میں خاصا فرق ہے، اس لیے ان کے حقِ تولیت کے احکام الگ ہوں گے، چنانچہ مفصل بحث کر کے آخر میں لکھتے ہیں:

> ''دونوں عبادت گاہوں کے درجے اور احکام میں پائے جانے والے ان اصولی و فروعی فروق کو حق تولیت کے معاملے میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اس پر بھی گہرے طور پر اثر انداز ہوتے ہیں''۔

تعجب ہے کہ مسلم مفکرین کو تو حقِ تولیت قیاس سے ثابت کرنے پر کوس رہے ہیں، لیکن خود یہ فرق بھی قیاس سے نکال رہے ہیں کہ ان دونوں گروہوں کے نام الگ الگ رکھنا، جزیہ کے حکم میں فرق، عبادت گاہوں کی بقا و ہدم میں فرق اور اس جیسے دیگر فروق ''دلالت'' کرتے ہیں کہ حقِ تولیت میں بھی فرق ہے، اگر قاری صاحبؒ بالفرض اپنی عبارت میں ''**اشتراک العلة یدل علٰی اشتراک الحکم**'' والا ''قیاس'' پیش کر رہے تھے، تو آنجناب ''**افتراق العلة یدل علی افتراق الحکم**'' والا قیاس پیش نہیں کر رہے ہیں؟ یا للعجب۔

تمہاری زلف میں پہنچی تو حسن کہلائی
وہ تیرگی جو میرے نامۂ اعمال میں تھی

اس پوری مفصل بحث میں آنجناب نے اپنے اس ''قیاس'' پر پورا زور صرف کرنے کے علاوہ حقِ تولیت کے حوالے سے اپنے موقف پر ایک بھی ''صریح دلیل'' نہیں دی۔

نکتہ نمبر:۳......آنجناب نے اپنا سارا زور اس پر صرف کیا کہ مشرکین مکہ کی تولیت سے محرومی کی واحد وجہ ''شرک'' ہے اور اہل کتاب چونکہ قرآنی اصطلاح کے اعتبار سے مشرکین نہیں ہیں، اس لیے یہ

’’قیاس‘‘ غلط ہے۔ہم آنجناب سے پوچھتے ہیں کہ پھر مسجدِ حرام کی تولیت کے معاملے میں اہلِ کتاب کا کیا حکم ہے؟ کیونکہ وہ مشرکین نہیں ہیں! ظاہر ہے کہ اللہ نے مسجدِ حرام سے صرف مشرکین کی بے دخلی کے بارے میں ’’صریح نص‘‘ نازل کی ہے؟ کیا آنجناب کے پاس اس حوالے سے ایک بھی ’’صریح نص‘‘ ہے کہ اہلِ کتاب مسجدِ حرام کی تولیت کے حق دار نہیں ہیں؟ آنجناب ’’ **أخرجو الیھود و النصاریٰ من جـزیرۃ العرب** ‘‘ جیسی نصوص پیش کریں گے، لیکن عرض یہ ہے کہ جب حضرت عمرؓ کی بیت المقدس کے بارے میں یہود کے حوالے سے لگائی جانے والی ایک شرط ’’ **ولا یسکن بإیلیا معھم أحد من الیھود** ‘‘ مسجدِ اقصیٰ پر یہود کی تولیت سے آنجناب کے بقول مانع نہیں بنتی تو ’’ **أخرجوا الیھود والنصاریٰ** ‘‘ والی نص اہلِ کتاب کی تولیت سے مانع کیسے بنے گی؟ نیز اگر اہلِ کتاب اس پر اپنے ’’مذہبی حق‘‘ کا یوں دعویٰ کریں کہ ’’یہ گھر بنی اسرائیل کے جدِ امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا ہے اور جب بنی اسرائیل کے ایک پیغمبر حضرت سلیمان علیہ السلام نے جو گھر بنایا، آپ اس پر ہمارا ’’تاریخی و مذہبی حق‘‘ تسلیم کرتے ہیں تو اس گھر پر ہمارا حق کیونکر نہیں ہوگا، جو سب بنی اسرائیل کے جدِ امجد نے تعمیر کیا ہے؟‘‘ آنجناب اس حوالے سے کیا ’’تحقیق‘‘ پیش فرمائیں گے؟

اصل بات یہ ہے کہ نصوص میں بطورِ علت شرک کا جو بیان ہوا ہے، اس میں مقصود اہلِ کتاب سے احتراز ہے ہی نہیں، جیسا کہ آنجناب کا گمان ہے، بلکہ وہ علت ایمان کے مقابلے میں بیان ہوئی ہے۔ گویا اس میں مشرکین کا تقابل مومنین کے ساتھ کیا گیا ہے، نہ کہ اہلِ کتاب کے ساتھ، یعنی مشرکین مکہ کو اس لیے مسجدِ حرام کی تولیت نہیں مل سکتی، کیونکہ وہ مشرک ہیں یعنی مومن نہیں ہیں۔ علمی اصطلاح میں اس کو یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ حصر اضافی ہے، نہ کہ حقیقی۔ چنانچہ علامہ آلوسیؒ سورۂ انفال کی آیت ’’إِنْ أَوْلِيَاءُهُ إِلَّا الْمُتَّقُوْنَ‘‘ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

’’ **وما أولیاء المسجد الحرام إلا المتقون من الشرک الذی لا یعبدون فیه غیرهٗ تعالٰی وا لمراد بھم المسلمون وھذہٖ المرتبة الأولٰی من التقوٰی** ‘‘۔ (۲)

اسی طرح مفسرین نے سورۂ براءت کی آیت ’’شَاهِدِيْنَ عَلٰى أَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ‘‘ میں صرف مشرکین کا ذکر نہیں کیا، بلکہ اہلِ کتاب کا بھی ذکر کیا، چنانچہ امام ابن کثیرؒ کی جو عبارت آنجناب نے نقل کی ہے، اس سے آگے عبارت یوں ہے: (جو آنجناب کو شاید ’’نظر‘‘ نہیں آئی)

’’ **وھم شاھدون علی أنفسھم بالکفر أی بحالھم و قالھم کما قال الذی لو سألت النصرانی: ما دینک؟ لقال: نصرانی، والیھودی ما دینک؟ لقال: یھودی، والصائبین و المشرک، لقال: مشرک** ‘‘۔ (۳)

نیز اس بات کی تائید اگلی آیت سے بھی ہوتی ہے اس میں ’’ **مساجد اللّٰہ** ‘‘ کی تولیت صرف غیر مشرکین یعنی مومنین کا حق بتلایا گیا ہے:

’’ إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ أَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ إِلَّا اللّٰهَ‘‘۔ (البراءۃ:۱۸)

’’اللہ کی مسجدوں کو تو وہی لوگ آباد کرتے ہیں، جو اللہ اور آخرت پر ایمان لائے ہوں اور نماز قائم کریں، زکوۃ ادا کریں اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈریں‘‘۔

اس موقع پر آنجناب نے مسجدِ اقصیٰ و مسجدِ حرام اور مشرکین و اہل کتاب کے درمیان جتنے ’’فروق‘‘ بیان کیے ہیں اور دونوں کے جدا جدا احکامات پر جتنا ’’زور‘‘ صرف کیا ہے، ان کو یہاں زیر بحث لانا بے فائدہ ہے، کیونکہ ان فروق کی وجہ سے ان دو مقدس مقامات کی تولیت میں فرق نکالنا آنجناب کا ’’قیاس‘‘ ہے، جس پر آنجناب نے پوری بحث میں کوئی ’’دلیل‘‘ نہیں دی۔ اس کے علاوہ یہ سارے فروق واقعی حق تولیت میں بھی ’’علتِ مؤثرہ‘‘ کا کردار ادا کرتے ہیں، اس پر بھی ’’دلیل‘‘ کی ضرورت ہے، کیونکہ مقیس و مقیس علیہ کا تمام اوصاف میں کلی ’’اشتراک‘‘ صحتِ قیاس کے لیے کسی کے نزدیک بھی شرط نہیں ہے۔

آنجناب نے مسجدِ حرام کی تولیت سے مشرکین کی محرومی کی علت ’’شرک‘‘ نکالی ہے، اس پر سوال یہ ہے کہ اس حکم کی علۃ العلۃ کیا ہے؟ یعنی شرک کیوں ایک مقدس گھر کی تولیت سے بے دخلی کی علت ہے؟ تو اس بارے میں گزارش یہ ہے کہ اس حکم کی اصل علت ’’اللہ کی نافرمانی اور تکذیبِ پیغمبر‘‘ ہے کہ مشرکین چونکہ اپنے شرک کی آڑ میں اللہ کی نافرمانی اور اللہ کے ایک جلیل القدر پیغمبر کی تکذیب کر رہے تھے، تو اللہ نے اُنہیں اس گھر کی تولیت سے محروم کر دیا اور یہی علت اہل کتاب میں بھی پائی جاتی ہے، اس لیے وہ بھی ایک مقدس گھر کی تولیت سے محروم ہوں گے۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ یہود کی بیت المقدس سے دو مرتبہ جلاوطنی، اللہ کی نافرمانی اور اس کے جلیل القدر پیغمبروں کی تکذیب اور ان کی اطاعت سے انکار کی وجہ سے ہوئی تھی۔ سورۂ اسراء کی ابتدائی آیات اس پر شاہد ہیں، اور یہی علت آج کے یہودیوں میں موجود ہے، اس لیے وہ اس مقدس گھر کی تولیت کے قطعاً حقدار نہیں ہوں گے۔

نکتہ نمبر:۴......اس بحث کے آخر میں آنجناب نے ایک ’’تضاد‘‘ کا دعویٰ بھی کیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

’’علاوہ ازیں اس تضاد کا کیا حل ہے کہ جب اسلام میں اہل کتاب کی عام عبادت گاہوں کو تحفظ دیا گیا اور ان پر اہل مذہب کی تولیت و تصرف کا حق تسلیم کیا گیا، تو ان کے قبلہ اور مرکزِ عبادت کے بارے میں یہ فیصلہ کیوں کیا گیا کہ وہ اس پر تولیت، تصرف اور اس میں عبادت کا حق نہیں رکھتے؟‘‘۔

آنجناب کو یہ تضاد اس لیے نظر آ رہا ہے کہ آنجناب کے نزدیک مسجدِ اقصیٰ کی حیثیت محض یہود کی ایک قومی عبادت گاہ اور مرکزِ عبادت کی ہے اور آنجناب اس کو صرف یہود کا مرکزِ عبادت ’’فرض‘‘ کر کے ساری بحث کر رہے ہیں، حالانکہ ہم اس کی وضاحت بار بار کر چکے ہیں کہ مسجدِ اقصیٰ صرف یہود کا قبلہ و مرکز

نہیں ہے، بلکہ وہ دنیا کے ان چند مقدس مقامات میں سے ایک مقدس مقام ہے، جس کی بنیاد، تعمیر، اور تجدید اللہ کے حکم سے اللہ کے جلیل القدر انبیاءؑ نے کی ہے اور ایسے مقدس مقامات کے بارے میں ''سنت اللہ'' یہی ہے کہ وہ ہر زمانے کے اہلِ حق کو ملتے ہیں۔ یہود کو بھی ایک زمانے میں یہ مقام اسی لیے ملا تھا کہ وہ اس وقت اہلِ حق تھے۔ اگر آنجناب اپنا زاویۂ نظر تبدیل کرلیں، تو اس میں ایک رتی کے برابر تضاد نہیں ہے۔ اپنے ذہن سے ''غلط مقدمات'' فرض کرکے جب احکاماتِ شریعت پر نظر ڈالیں گے تو تضادات کے سوا کیا نظر آئے گا؟

فتح بیت المقدس کی بشارت

جناب عمار صاحب نے ''دلائلِ شرعیہ'' پر نقد کرتے ہوئے ایک ''دلیل'' یہ بھی بیان کی ہے کہ بعض حضرات احادیث میں بیت المقدس کی فتح کی بشارت کو بھی مسجدِ اقصیٰ کی تولیت کی دلیل بناتے ہیں۔ آنجناب نے اس پر اعتراض یہ کیا ہے کہ بیت المقدس شہر کی فتح کی بشارت سے وہاں پر موجود عبادت گاہوں پر تولیت کا حق کہاں سے لازم آیا؟ کیونکہ کسی شہر کا فتح ہوکر مسلمانوں کے قبضے میں آنا اور بات ہے، جبکہ وہاں پر موجود عبادت گاہوں پر تولیت ایک اور بحث ہے۔

آنجناب سے گزارش ہے کہ نصوصِ شرعیہ میں بیت المقدس کا لفظ مسجدِ اقصیٰ کے لیے ہی استعمال ہوا ہے، اس لفظ کا بلدِ قدس کے لیے استعمال کا رواج محققین کے نزدیک خلافتِ عباسیہ کے دور میں خصوصاً ہارون الرشید کے دور میں شروع ہوا(۴) لہٰذا جب اس سے مراد ہی مسجدِ اقصیٰ ہے تو پھر ان احادیث کو تولیت کی دلیل کیوں نہیں بنایا جاسکتا؟ ذیل میں چند نصوص ذکر کرتے ہیں، جن میں مسجدِ اقصیٰ کے لیے بیت المقدس کا لفظ استعمال ہوا ہے:

۱:...... نسائی شریف میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاتھوں مسجدِ اقصیٰ کی تعمیر کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے:

''لَمَّا فرغ سليمانُ من بناء بيت المقدس سأل اللّٰهَ ثلاثاً''۔(۵)

۲:...... معراج کی رات آپ ﷺ مسجدِ اقصیٰ میں داخل ہوئے اور آپ ﷺ کے اعزاز کے لیے انبیاءؑ کو جمع کیا گیا، اس کا ذکر یوں ہے:

''ثم دخلت بيت المقدس ، فجمع لي الأنبياءُ''۔ (۶)

۳:...... جب آپ ﷺ معراج سے واپس تشریف لائے اور علی الصباح یہ واقعہ بیان کیا تو مشرکین نے امتحاناً مسجدِ اقصیٰ کے بارے میں سوالات شروع کردیے، اللہ تعالیٰ نے مسجدِ اقصیٰ کو آپ ﷺ کے سامنے ظاہر کردیا، اس کا ذکر یوں ہوا ہے:

''فجلا اللّٰه لي البيت المقدس''۔ (۷)

۴:...... امام ابوداوٗدؒ نے باب باندھا ہے:

’’ باب من نذر أن یصلی فی بیت المقدس ‘‘۔ (۸)

۵:......امام ابن ماجہؒ نے باب باندھا ہے:

’’ باب من أھل من بیت المقدس ‘‘۔ (۹)

۶:...... ترمذی شریف میں حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کا ایک لمبا واقعہ مذکور ہے، اس میں حضرت یحییٰ علیہ السلام نے مسجدِ اقصیٰ میں بنی اسرائیل کو جمع کیا، اس کا تذکرہ یوں آیا ہے:

’’ فجمع الناس فی بیت المقدس فامتلأ المسجد ‘‘۔ (۱۰)

۷:...... حضرتِ حذیفہ بن یمانؓ کی روایت میں ہے:

’’ أصلی رسول اللّٰہ ﷺ فی بیت المقدس ؟ ‘‘۔ (۱۱)

۸:...... امام رازیؒ تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں:

’’ وقولہ (إلی المسجد الأقصیٰ) اتفقوا علی أن المراد منہ بیت المقدس ‘‘۔ (۱۲)

۹:......روح المعانی میں علامہ آلوسیؒ لکھتے ہیں:

’’ (إلی المسجد الأقصیٰ) وھو بیت المقدس ‘‘۔ (۱۳)

۱۰:......امام ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

’’ (إلی المسجد الأقصیٰ) وھو بیت المقدس ‘‘۔ (۱۴)

ان نصوص سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہوتی ہے کہ بیت المقدس کا لفظ قرآن وحدیث میں مسجدِ اقصیٰ کے لیے ہی بولا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ آنجناب نے شاید ’’قصداً‘‘ اس بشارت اور پیش گوئی پر اکتفا کیا، حالانکہ اس حوالے سے مزید نصوص بھی آئی ہیں، کاش! آنجناب ان پر بھی ’’خامہ فرسائی‘‘ فرماتے۔ اب ان میں سے چند کا ذکر کیا جاتا ہے:

۱:......مسجدِ اقصیٰ میں دجال (یہود کا سربراہ) داخل نہیں ہو سکے گا۔ (۱۵)

۲:...... بیت المقدس میں مسلمان قربِ قیامت میں محصور ہوں گے۔ (۱۶)

۳:......بیت المقدس کی خرابی و بربادی کے ساتھ مدینہ منورہ کی خرابی و بربادی کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ (۱۷)

۴:......ابوابِ بیت المقدس پر جو لشکر جہاد کرے گا، وہ حق لشکر ہوگا۔ (۱۸)

تکوینی مشیت اور تشریعی حکم میں فرق

جناب عمار صاحب نے مسجدِ اقصیٰ سے یہود کی بے دخلی کے واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہود پر ان کی نافرمانی کے نتیجے میں بخت نصر اور دوسرے فاتحین کا مسلط ہونا خالص ایک تکوینی معاملہ ہے، اس لیے اسے اپنے حق میں دلیل نہیں بنایا جا سکتا۔ آنجناب نے یہاں بھی ’’خلطِ مبحث‘‘ سے کام لیا، حالانکہ سورۂ اسراء میں مذکور واقعات تشریعی اور تکوینی دونوں قسم کے احکام پر مشتمل ہیں:

۱:......حکم تشریعی تو یہ ہے کہ نافرمانی اور سرکشی کی وجہ سے یہود سے مسجدِ اقصیٰ کی تولیت چھین لی گئی، یہ وہی ضابطہ ہے جو کتبِ سماویہ میں بار بار بیان ہوا ہے۔ لہٰذا آئندہ جو بھی گروہ اور جماعت اس طرح نافرمانی کا ارتکاب کرے گی، وہ اس گھر کی تولیت سے یہود کی طرح محروم ہوگی۔

۲:......اس نافرمانی کے نتیجے میں ان پر ایسے فاتحین مسلط ہونا، جنہوں نے بیت المقدس کو ویران و برباد کیا، یہ ایک خالص تکوینی معاملہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسی کی مذمت ''وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰهِ '' میں بیان کی ہے، اس لیے اگر اب کوئی ان واقعات سے استدلال کرتے ہوئے اس مقدس مقام کی بے حرمتی روا رکھے گا، تو وہ یقیناً مذمت کا مستحق ہوگا۔ اب امتِ مسلمہ کے مفکرین اس تکوینی معاملے سے استدلال کرتے ہوئے مسجدِ اقصیٰ کی حرمت کو پامال کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، یا وہ اس میں بیان کیا ہوا حکم اور اللہ کی ''سنت'' سے استدلال کرتے ہوئے یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ مقدس گھر اس ''مغضوب علیهم'' قوم کو نہ دیا جائے؟ آنجناب خود فیصلہ کرلیں۔

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ أَنْ يَّعْمُرُوْا مَسَاجِدَ اللّٰهِ کی تعمیم

آنجناب نے لکھا ہے کہ اس آیت کے عموم سے استدلال کرتے ہوئے تمام مساجد اور تمام کفار کو اس حکم میں شامل کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ یہ صرف مسجدِ حرام کے بارے میں ہے اور یہ حکم صرف مشرکین کے ساتھ خاص ہے۔ آنجناب سے گزارش ہے کہ اگر استدلال کرنا بھی ہے تو وہ اس آیت کی بجائے اگلی آیت سے ہوتا ہے، اس میں اللہ نے اپنے گھروں کے بارے میں ایک عمومی ضابطہ بیان کیا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

'' إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ أَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ إِلَّا اللّٰهَ ''۔ (البراءة:۱۸)

ترجمہ: ''اللہ کی مسجدوں کو تو وہی لوگ آباد کرتے ہیں، جو اللہ اور آخرت پر ایمان لائے ہوں اور نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈریں''۔

اس کی تفسیر میں امامِ اہل سنت امام ماتریدیؒ لکھتے ہیں:

'' فذلک كله على المسلمين أي عليهم عمارة المساجد و بهم تعمر المساجد ولهم ينبغي أن يعمروها ''۔(۱۹)

ترجمہ: ''یہ سارے کام مسلمانوں کا فریضہ ہیں، یعنی ان کی ذمہ داری مساجد کو آباد کرنا ہے، اور انہی سے مساجد حقیقت میں آباد ہوتی ہیں اور انہی کا حق ہے کہ وہ مساجد کو آباد کریں''۔

بیت المقدس میں یہود کا قیام

حضرت عمرؓ نے بیت المقدس کی فتح کے وقت جو شرائط لگائیں تھیں، ان میں ایک شرط یہ بھی

شامل تھی کہ یہود میں سے کوئی بھی بیت المقدس میں قیام نہیں کر سکے گا۔ اب یہ شرط کتنی صراحت کے ساتھ یہود کی تولیت کی نفی کر رہی ہے! کیونکہ اگر واقعی ازروئے ''شریعت'' مسجدِ اقصیٰ پر یہود کا حق ہوتا تو حضرت عمرؓ اس میں ضرور کوئی ایسا استثناء کرتے، جس سے ان کا یہ ''شرعی حق'' پامال نہ ہوتا۔ یہ کونسی ''عدالت'' ہے کہ عیسائیوں کی عام عبادت گاہ کا تو اتنا خیال رکھ رہے ہیں کہ ان میں نماز بھی پڑھنا گوارا نہیں کر رہے ہیں، لیکن یہود کو نہ صرف ان کی ''مرکزی عبادت گاہ'' سے محروم رکھ رہے ہیں، بلکہ انہیں اس شہر میں قیام کی اجازت نہیں دے رہے ہیں کہ وہ کم از کم اُسے دیکھ ہی لیا کریں؟

آنجناب نے جو اس کا ''شاہکار جواب'' دیا ہے، قارئین بھی اس سے لطف اندوز ہوں۔ آنجناب نے لکھا ہے کہ: ''یہ شرط اصل میں عیسائیوں کی درخواست پر لگائی گئی، جو پرانے زمانے میں ایک رومی بادشاہ نے لگائی تھی اور عیسائی اسی شرط کو برقرار رکھنا چاہ رہے تھے''۔ اب جناب عمار صاحب کو کون بتائے کہ کیا اس شرط کا پس منظر اور سبب بتانے سے کیا یہ بات ثابت ہوگئی کہ حضرت عمرؓ کی نظر میں ان کا حق تولیت باقی ہے؟ نیز مسلمان فاتح تھے یا مفتوح کہ عیسائیوں کی درخواست پر ایک ''غیر شرعی'' شرط لگانے پر آمادہ ہوگئے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ شرط اور مسجدِ اقصیٰ پر یہود کی تولیت ایک دوسرے کے بالکل معارض ہے۔ اگر آنجناب کا موقف تسلیم کرلیں کہ مسجدِ اقصیٰ پر یہود کا ''تاریخی و مذہبی حق'' باقی ہے اور ازروئے شریعت ان کا یہ حق منسوخ نہیں ہوا، تو حضرت عمرؓ کی عدالت پر ایسا دھبہ لگتا ہے جس کی امت کے تمام مفکرین مل کر بھی مناسب توجیہ نہیں کر سکتے، کیونکہ مسجدِ اقصیٰ پر یہود کا حق تسلیم کرتے ہوئے اس شرط کی اس کے سوا کوئی توجیہ نہیں ہوسکتی کہ انہوں نے یہ شرط لگا کر یہود کا یہ حق ''غصب'' کرلیا جو شریعت کی رو سے اُنہیں عطا ہوا تھا۔

حوالہ جات

۱......البقرۃ:۲۶۔
۲......روح المعانی، ۹/۲۰۲۔
۳......ابنِ کثیر، ۷/۱۵۸۔
۴......المدخل الی دراسۃ المسجد الاقصی، ص:۳۱۔
۵......سنن نسائی، فضل المسجد الاقصیٰ، رقم الحدیث:۶۹۲۔
۶......نسائی، فرض الصلاۃ، رقم الحدیث:۴۴۹۔
۷...... بخاری، حدیث الاسراء، رقم الحدیث:۳۸۸۶۔
۸......ابوداؤد، ص:۳۷۱۔
۹......ابنِ ماجہ، ۲/۹۹۸۔
۱۰......ترمذی، مثل الصلوۃ والصیام والصدقۃ، رقم الحدیث:۲۸۶۳۔
۱۱......ترمذی، کتاب التفسیر، رقم ۳۱۴۷۔
۱۲......تفسیرِ کبیر، ۲۰/۱۴۷۔
۱۳......روح المعانی، ۱۵/۹۔
۱۴......ابن کثیر، ۸/۳۷۳۔
۱۵......مسند احمد، ۳۲/۳۴۹۔
۱۶......ایضاً۔
۱۷......مسندِ احمد، ۳۶/۶۵۷۔
۱۸......ایضاً۔
۱۹......تاویلات، ۵/۳۱۷۔

(جاری ہے)

تصوف!

قرآن وسنت کی روشنی میں (دوسری اور آخری قسط)

ڈاکٹر بشیر احمد رِند

۴:...... برداشت اور رَواداری

صوفیائے کرام کا یہ شیوہ رہا ہے کے وہ اپنے اور پرائے، مسلم اور غیر مسلم، نیک اور بد، موافق اور مخالف سب کے ساتھ برداشت، رَواداری اور حسن سلوک کا رویہ رکھتے ہیں اور اپنے معتقدین کو بھی اسی چیز کا درس دیتے ہیں، چنانچہ حضرت حسن بصریؒ کے بارے میں منقول ہے کہ:
''اُنہیں کچھ لوگوں نے بتایا کہ فلاں شخص آپ کی عیب گوئی کررہا ہے، تو آپؒ نے بجائے اس پر غصہ کرنے یا انتقام لینے کے بطورِ تحفہ اس کو تازہ کھجوریں بھیج دیں''۔ (۱)

بندۂ عشق از خدا گیرد طریق
می شود بر کافر و مؤمن شفیق (۲)

''جو بندہ عشقِ الٰہی میں سرشار ہوتا ہے وہ الٰہی راستے پر چلتا ہے اور (برداشت اور رَواداری سے کام لیتے ہوئے) مؤمن وکافر سب پر مہربان ہوتا ہے''۔

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم
از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

''ہم نے سکندر ودارا کے قصے نہیں پڑھے، ہم سے محبت اور وفاداری کے سوا اور کوئی بات مت پوچھ''۔

اس سلسلے میں شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ فرماتے ہیں:

هوچوئني تون م چئو واتان ورائي
اڳ اڳرائي جوڪري خطا سو ڪائي
پاند ۾ پائي ويو ڪيني وارو ڪين ڪي (۳)

’’اے دوست! اگر کوئی تمہیں برا بھلا کہے تو پلٹ کر اسے جواب نہ دو (بلکہ برداشت سے کام لو) ایسی باتوں میں جو پہل کرتا ہے وہی خطا کار ہوتا ہے، حسد اور کینہ اندر رکھنے والا کچھ حاصل نہیں کر پاتا‘‘۔

شاہ صاحبؒ کا یہ شعر صوفیانہ فلسفے اور رواداری کی کتنی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ اسی کو تو برداشت اور رَواداری کہا جاتا ہے کے دوسروں کی چڑ دلانے والی باتوں کو برداشت کیا جائے اور بجائے انتقام لینے کے عفو و درگزر سے کام لیا جائے۔

اسی تعلیم کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

’’وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ‘‘۔(۴)

ترجمہ: ’’اور (جنت ایسے لوگوں کے لیے تیار ہے) جو غصے کو دباتے ہیں اور لوگوں کو معاف کرتے ہیں (اور لوگوں کے ساتھ احسان کا برتاؤ کرتے ہیں) اور خدا احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے‘‘۔

مذہبی رَواداری کا حکم دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

’’لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ‘‘۔(۵)

ترجمہ: ’’تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین ہے۔‘‘

کسی کے باطل مذہبی رہنما یا باطل خدا کو بھی برا بھلا کہنے سے روکتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

’’وَلَا تَسُبُّوْا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوْا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ‘‘۔(۶)

ترجمہ: ’’تم ان کو برا بھلا مت کہو، جن کو لوگ پوجتے ہیں خدا کو چھوڑ کر، ورنہ وہ دشمنی اور نادانی کی بنا پر اللہ تعالیٰ کو برا بھلا کہنا شروع کریں گے۔‘‘

مذہبی مخالفت کی بنا پر کسی سے بے انصافی کرنے سے روکتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

’’وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰى اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى‘‘۔(۷)

ترجمہ: ’’کسی قوم کی عداوت تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم ان کے ساتھ ناانصافی کرو، تم انصاف کرو، انصاف تقویٰ کے قریب ہے۔‘‘

جو لوگ نبی کریم ﷺ کے خلاف سازشیں کرتے تھے اور جاہلانہ رویے سے پیش آتے تھے، اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ان کے ساتھ نرمی کرنے، درگزر کرنے، رَواداری اور برداشت سے پیش آنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

’’خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ‘‘۔(۸)

ترجمہ: ’’عفو و درگزر سے کام لو، اچھائی کا کہتے رہو اور جاہلوں سے روگردانی

کرتے رہو۔‘‘

آپ ﷺ نے برداشت اور رَواداری کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

’’لا تکونوا إمَّعَةً تقولون: إن أحسن الناسُ أحسنًا وإن ظلموا ظلمنا ولکن وطنوا أنفسکم، إن أحسن الناسُ أن تحسنوا وإن أساء وا فلا تظلموا ‘‘۔ (۹)

’’انتقام اور بدلہ لینے والا ذہن مت رکھو کہ یوں کہو کہ: اگر لوگ ہمارے ساتھ اچھائی کریں گے تو ہم بھی ان کے ساتھ اچھائی کریں گے، لیکن اگر وہ ہم پر ظلم کریں گے تو ہم بھی ان پر ظلم کریں گے، بلکہ یہ ذہن بناؤ کہ اگر لوگ تمہارے ساتھ اچھائی کریں تو تم ان کے ساتھ اچھائی کرو، لیکن اگر وہ تمہارے ساتھ برائی کریں تو تم ان کے ساتھ ظلم مت کرو (بلکہ عدل وانصاف سے کام لو)۔

آپ ﷺ اور آپ کے اصحاب کرامؓ پر اہل مکہ کے مظالم اور ستم رسانیاں سب کو معلوم ہیں، لیکن فتح مکہ کے موقع پر ان پر قابو پانے کے بعد آپ ﷺ نے جس بردباری اور رواداری کا ثبوت دیا، انسانی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی، چنانچہ آپ ﷺ نے بیت اللہ کے سامنے کھڑے ہو کر عام معافی کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا:

’’لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ اِذْهَبُوْا فَأَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ‘‘۔ (۱۰)

ترجمہ: ’’تم پر کچھ الزام نہیں، جاؤ! تم سب آزاد ہو۔‘‘

اس سے صاف ظاہر ہے کہ صوفیاً کا تحمل اور رواداری کو اپنانا یا اس کی تعلیم دینا سراسر قرآن وسنت سے ماخوذ ہے۔

۵:......خدمتِ خلق

اس وقت دنیا میں Give and take ’’لو اور دو‘‘ کا اصول عوام الناس کی فطرت کا لازمی حصہ بن چکا ہے۔ کوئی شخص کسی کے ساتھ حسن سلوک کرنے سے پہلے یہ سوچتا ہے کہ اسے بدلے میں کیا ملے گا؟ جب تک یہ امید نہ ہو، اس وقت تک کوئی قدم نیکی کی طرف نہیں اُٹھتا اور نہ کسی اور کی تکلیف کا احساس ہوتا ہے۔

خودغرضی اور نفس پرستی کے اس جذبے کے برعکس صوفیاً کرام عوام الناس میں یہ روح پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ ذاتی مفاد سے بالاتر ہو کر انسانیت کو فائدہ پہنچایا جائے۔ صوفیاً کے ہاں خلقِ خدا کی خدمت سے بڑھ کر کوئی نیکی کا عمل نہیں۔

چنانچہ شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں:

دل بدست آور کہ حج اکبر است

’’لوگوں کو فائدہ پہنچا کر ان کا دل خوش کرو کہ یہ حج اکبر ہے‘‘۔

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست
بتسبیح و سجادہ و دلق نیست (۱۱)

’’طریقت خدمتِ خلق کے علاوہ اور کسی چیز کا نام نہیں۔تسبیح، جائے نماز اور گدڑی کا نام نہیں‘‘۔

سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاءؒ فرماتے ہیں:

’’قیامت کے بازار میں کوئی اسباب اس قدر قیمتی نہ ہوگا جس قدر دلوں کو راحت پہنچانا‘‘۔ (۱۲)

اور ان حضراتِ صوفیاؒ کے ہاں خلق آزاری سے بڑھ کر کوئی جرم کا عمل نہیں، چنانچہ حافظ شیرازیؒ فرماتے ہیں:

مباش در پئے آزار وہرچہ خواہی کن
کہ در طریقتِ ما بیش ازیں گناہے نیست (۱۳)

’’خدا کی مخلوق کی اذیت کے در پئے مت ہو، باقی جو چاہو کرو، کیونکہ ہم صوفیاؒ کے طریقے میں خلق آزاری سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں۔‘‘

اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ خلقِ خدا کو خدا کا کنبہ سمجھتے ہیں، اس لیے خلقِ خدا کی خدمت کو خدا کی خدمت اور خلقِ خدا کی اذیت کو خدا کو اذیت پہنچانے کے برابر سمجھتے ہیں۔ مولانا حالیؒ کہتے ہیں:

یہ پہلا سبق تھا کتابِ ہدیٰ کا
کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا (۱۴)

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ صوفیاؒ حضرات انسانیت سے کتنی محبت کرتے ہیں اور ان کی راحت رسانی کی کتنی فکر کرتے ہیں، اور ان کے ہاں خلق آزاری کتنا بڑا جرم ہے!۔

اب ہم قرآن وسنت کی روشنی میں خدمتِ خلق کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہیں:

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ مؤمنین کی خصوصی صفات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

’’وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ‘‘۔ (۱۵)

ترجمہ: ’’وہ اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ وہ خود حاجت مند ہوتے ہیں‘‘۔

دوسری جگہ پر ارشاد باری ہے:

’’وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّ أَسِيْرًا ، إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَانُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَّلَا شُكُوْرًا‘‘۔ (۱۶)

ترجمہ: ''وہ خدا کی محبت کی خاطر مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں (اور کہتے ہیں) ہم تو تم کو بس اللہ کی رضا کی خاطر کھانا کھلاتے ہیں، اور نہ تم سے اس کا عوض چاہتے ہیں اور نہ شکریہ۔''

مطلب یہ کہ مؤمنین کسی کے ساتھ بھلائی کرتے وقت یہ نہیں دیکھتے کہ اُنہیں بدلے میں کیا ملے گا، وہ تو صرف خدا کی رضا کی خاطر خدا کی مخلوق کی خدمت کرتے ہیں۔

آپ ﷺ نے خلقِ خدا کی خدمت پر ابھارنے کے لیے مختلف طریقوں سے ترغیب دی ہے، ایک موقع پر فرمایا:

''الساعی علی الأرملة والمساکین کالساعی فی سبیل اللّٰه، أحسبه قال: کالقائم لا یفتر وکالصائم لا یفطر''۔ (۱۷)

''بیواؤں اور مسکینوں کی مدد کرنے والا (خدا کے ہاں) ایسا ہے جیسے مجاہد فی سبیل اللہ، (راوی کہتے ہیں: میرا گمان ہے کہ) آپ ﷺ نے فرمایا: وہ ساری رات جاگ کر عبادت کرنے والے اور ہمیشہ روزے رکھنے والے کی طرح ہے۔''

ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا:

''تری المؤمنین فی تراحمهم وتوادهم وتعاطفهم کمثل الجسد، إذا اشتکی عضو تدعی لهٗ سائرُ الجسد بالسهر والحُمّی''۔ (۱۸)

''ایک دوسرے کے ساتھ رحم، محبت اور نرمی کرنے کے لحاظ سے تم دیکھو گے کہ مؤمن ایک جسم کی طرح ہیں، جسم کا جب کوئی ایک عضو تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے تو سارا جسم بے خوابی اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔''

ایک اور روایت میں فرمایا:

''والذی نفسی بیدہٖ لا یؤمن عبد حتّٰی یحب لأخیه ما یحب لنفسه''۔ (۱۹)

''اس ذات کی قسم! جس کے قبضے میں میری جان ہے، کوئی بندہ اس وقت تک کامل مؤمن ہو ہی نہیں سکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے وہ چیز پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔''

ظاہر ہے کہ ہر کوئی اپنے ساتھ اچھائی اور نیکی چاہتا ہے اور اپنے ساتھ کبھی بھی برائی یا بدسلوکی پسند نہیں کرتا، اسی طرح ایک مؤمن بھی سب کی بھلائی چاہتا ہے اور کسی کی برائی نہیں چاہتا۔

مذکورہ بحث سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ''تصوف'' اور صوفیائے حضرات کی تعلیم دراصل قرآن وسنت کا نچوڑ اور اس کی عملی صورت ہے۔

خلاصہ/ نتائج

مذکورہ بالا بحث سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ ہوتے ہیں:

۱:......''تصوف'' عشق اور محبتِ خداوندی کا درس دیتا ہے۔

۲:......''تصوف'' اطاعتِ رسول (ﷺ) پر ابھارتا ہے اور ''تصوف'' کی نظر میں اطاعتِ رسول (ﷺ) کے بغیر خدا کی رضا کا حصول ناممکن ہے۔

۳:......''تصوف'' اپنے آپ کو فضائلِ اخلاق سے مزین کرنے اور رذائلِ اخلاق سے پاک کرنے کا درس دیتا ہے۔

۴:......''تصوف'' خلقِ خدا کی محبت اور اس کی خدمت کی تلقین کرتا ہے اور مخلوق کی کمی کوتاہیوں سے درگزر کرنے اور ان سے حسنِ خلق رکھنے کا سبق دیتا ہے اور صوفیاؒ کی نظر میں خلق آزاری سے بڑا کوئی گناہ نہیں۔

۵:......''تصوف'' دوست اور دشمن، اپنے اور پرائے کے فرق کے بغیر سب کے ساتھ رَواداری اور برداشت کا درس دیتا ہے۔

۶:......''اسلامی تصوف'' دراصل قرآن وسنت کا نچوڑ اور اسلامی تعلیمات کی روح اور اس کی عملی صورت کا نام ہے۔

مصادر ومراجع

۱......عطار شیخ فریدالدینؒ: تذکرۃ الاولیاء، مشتاق بک کارنر، لاہور، ص:۲۶۔
۲......علامہ اقبال بحوالہ ''تاریخ تصوف''، ص:۳۲۔
۳......شاہ جورسالو: سریمن کلیان، داستان:۸، ص:۹۸۔
۴......آل عمران:۱۲۴۔
۵......الکافرون:۶۔
۶......الانعام:۱۰۸۔
۷......المائدہ:۸۔
۸......الاعراف:۱۹۹۔
۹......مشکوٰۃ المصابیح، ص:۴۳۵۔
۱۰......ندوی سید سلیمانؒ: ''سیرت النبی ﷺ'' کراچی، دارالاشاعت، ۱۹۸۵ء، ص:۳۰۰۔
۱۱......بحوالہ تاریخِ تصوف، ص:۱۴۴۔
۱۲......ایضاً، ص:۱۴۵۔
۱۳......ایضاً، ص:۳۳۔
۱۴......ایضاً، ص:۳۲۔
۱۵......الحشر:۹۔
۱۶......الدھر:۸، ۹۔
۱۷......مشکوٰۃ المصابیح، ص:۴۲۲۔
۱۸......ایضاً، ص:۴۲۲۔
۱۹......صحیح البخاری، ص:۵، حدیث:۱۳۔

ٹی وی کے ذریعہ تبلیغ اسلام

مفتی عارف محمود

تبلیغ دین کا وسیلہ

کسی بھی نیک مقصد کے حصول کے لیے ناجائز وسائل و ذرائع کو اختیار کرنے کی اجازت نہیں۔ اچھے اور نیک مقصد کے لیے ذریعہ بھی جائز ہی ہونا چاہیے، کیوں کہ مسلمان جائز حدود کے اندر رہ کر کام کرنے کا مکلّف بنایا گیا ہے، جو بات اس کے بس سے باہر ہو اور اس میں اس کو جائز طریقے سے انجام دینے کی طاقت نہیں، تو وہ اس کا مکلّف نہیں رہتا ''لَایُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا ''لہٰذا اگر ہم جائز حدود میں رہ کر تبلیغ دین اور حفاظتِ دین کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں اور اس میں کوئی کوتاہی نہیں کرتے، تو قطع نظر اس بات سے کہ ہم اپنے اہداف میں کامیاب ہوتے ہیں یا نہیں، یقیناً عنداللہ ماجور ہوں گے اور اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ قرار پائیں گے، لیکن اس کے برعکس کوئی حدودشکنی کرتے ہوئے ''اسلام کی تبلیغ اور حفاظت'' کے خوش نما عنوان سے جتنی بھی کوشش کرلے مردود سمجھی جائے گی۔

''نقوشِ رفتگان'' سے اہم اقتباس

اس مضمون کو حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ نے حضرت بنوریؒ کے حوالے سے ''نقوشِ رفتگان'' میں اسلامی مشاورتی کونسل کے اجلاس کے دوران پیش آنے والے ایک واقعے کے ذیل میں ذکر فرمایا:

> ''کونسل کی نشستوں میں ایجنڈے سے باہر کی باتیں بھی بعض اوقات چھڑ جاتی ہیں، اسی سلسلہ میں دراصل ہوا یہ تھا کہ بعض حضرات نے مولانا (یوسف بنوریؒ) سے فرمائش کی تھی کہ وہ ٹیلی ویژن پر خطاب فرمائیں۔ مولانا نے ریڈیو پر خطاب کرنے کی تو ہامی بھر لی، مگر ٹیلی ویژن پر خطاب کرنے سے معذرت فرمادی تھی کہ یہ میرے مزاج کے خلاف ہے۔ اسی دوران غیر رسمی طور پر یہ گفتگو بھی سامنے آئی تھی کہ فلموں کو مخرب اخلاق عناصر سے پاک کرکے تبلیغی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اس بارے میں مولانا نے جو کچھ ارشاد فرمایا، اس کا خلاصہ یہ تھا:

''اس سلسلہ میں ایک اصولی بات کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ ہم لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بات کے مکلّف نہیں کہ جس طرح بھی ممکن ہو لوگوں کو پکا مسلمان بنا کر چھوڑیں ۔ ہاں ! اس بات کے مکلّف ضرور ہیں کہ تبلیغ دین کے لیے جتنے جائز ذرائع ووسائل ہمارے بس میں ہیں ، ان کو اختیار کر کے اپنی پوری کوشش صرف کر دیں ۔ اسلام نے ہمیں جہاں تبلیغ کا حکم دیا ہے ، وہاں تبلیغ کے باوقار طریقے اور آداب بھی بتائے ہیں ، ہم ان طریقوں اور آداب کے دائرے میں رہ کر تبلیغ کے مکلّف ہیں ۔ اگر ان جائز ذرائع اور تبلیغ کے ان آداب کے ساتھ ہم اپنی تبلیغی کوششوں میں کامیاب ہوتے ہیں تو یہ عین مراد ہے ۔

لیکن اگر بالفرض ان جائز ذرائع سے ہمیں مکمل کامیابی حاصل نہیں ہوتی تو ہم اس بات کے مکلّف نہیں ہیں کہ ناجائز ذرائع اختیار کر کے لوگوں کو دین کی دعوت دیں اور آدابِ تبلیغ کو پس پشت ڈال کر جس جائز وناجائز طریقے سے ممکن ہو ، لوگوں کو اپنا ہم نوا بنانے کی کوشش کریں ۔ اگر جائز وسائل کے ذریعے اور آدابِ تبلیغ کے ساتھ ہم ایک شخص کو بھی دین کا پابند بنا دیں گے تو ہماری تبلیغ کامیاب ہے اور اگر ناجائز ذرائع اختیار کر کے ہم سو آدمیوں کو بھی اپنا ہم نوا بنالیں تو اس کامیابی کی اللہ کے یہاں کوئی قیمت نہیں ، کیوں کہ دین کے احکام کو پامال کر کے جو تبلیغ کی جائے گی وہ دین کی نہیں ، کسی اور چیز کی تبلیغ ہوگی ۔ فلم اپنے مزاج کے لحاظ سے بذاتِ خود اسلام کے احکام کے خلاف ہے ، لہٰذا ہم اس کے ذریعے تبلیغ دین کے مکلّف نہیں ہیں ۔ اگر کوئی شخص جائز اور باوقار طریقوں سے ہماری دعوت قبول کرتا ہے تو ہمارے دیدہ ودل اس کے لیے فرشِ راہ ہیں ، لیکن جو شخص فلم دیکھے بغیر دین کی بات سننے کے لیے تیار نہ ہو ، اُسے فلم کے ذریعے دعوت دینے سے ہم معذور ہیں ۔ اگر ہم یہ موقف اختیار نہ کریں تو آج ہم لوگوں کے مزاج کی رعایت سے فلم کو تبلیغ کے لیے استعمال کریں گے ، کل بے حجاب خواتین کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا جائے گا اور رقص وسرود کی محفلوں سے لوگوں کو دین کی طرف بلانے کی کوشش کی جائے گی ، اس طرح ہم تبلیغ کے نام پر خود دین کے ایک ایک حکم کو پامال کرنے کے مرتکب ہوں گے ۔'' (نقوشِ رفتگاں ، ص:۱۰۴ ، ۱۰۵)

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہٗ کے تاثرات

حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے ان الفاظ کو نقل کرنے کے بعد حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ فرماتے ہیں :

''یہ کونسل میں موجود مولانا کی آخری تقریر تھی، اور غور سے دیکھا جائے تو یہ تمام دعوتِ دین کا کام کرنے والوں کے لیے مولانا کی آخری وصیت تھی، جو لوحِ دل پر نقش کرنے کے لائق ہے۔''

حضرت بنوریؒ کے ارشاد اور پھر آخر میں ان کے بارے میں حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی زیدمجدہٗ کے تأثر کو بار بار پڑھا جائے، عبرت کی نگاہ سے، نصیحت حاصل کرنے کی غرض سے اور اپنے اکابر کے نقش قدم پر چلنے کی نیت سے پڑھا جائے، تو اس سے ایک واضح راہنمائی ملے گی، صراطِ مستقیم پر استقامت نصیب ہوگی اور فتنوں سے حفاظت کے لیے ایک مضبوط ڈھال بن جائے گی۔

اشیاء کی ساخت اور مقاصد میں ربط

انسانی دنیا کا طریقہ کار رہے کہ کسی بھی مقصد کے حصول کے لیے اس کی نوع اور مناسبت سے ایک طریقۂ کار اختیار کیا جاتا ہے۔ مقصد اور اس کے طریقۂ کار میں نہایت گہرا اور مضبوط تعلق ہوتا ہے۔ کسی بھی ساخت کے اندر کی روح اور اس کی تأثیر کو اس سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا، جیسے کھڑے ہو کر کھانے کی محافل اور کھڑے ہو کر کھانے کے طریقۂ کار میں حرص، طمع اور لالچ کے قبیح مناظر ظہور پذیر ہوتے ہیں، یہ خاصہ ہے اس نظام کا جو کھڑے ہو کر کھانے سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی طرح نماز کی ادائیگی مسجد میں ایک خاص ماحول میں کی جاتی ہے تو اس میں تعلق مع اللہ اور روحانیت کے مظاہر ہوتے ہیں۔ یہی نماز مسجد سے باہر' شادی ہالوں اور کمیونٹی سینٹروں میں چلی جاتی ہے تو اس کی روحانیت سلب ہو جاتی ہے۔ ان مثالوں سے یہ بات بخوبی واضح ہوگئی کہ یہ کوئی بے کار اور غیر مؤثر شئے نہیں، بلکہ ہر ساخت ایک مخصوص مقصد کے حصول کے لیے معاون ومددگار رہوتی ہے۔

موجودہ میڈیا کے مذموم مقاصد

آیئے! اب ٹی وی اور موجودہ الیکٹرانک ذرائع کی ساخت ومقاصد پر بھی ذرا نظر دوڑائیں، تھوڑے سے غور وفکر سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ٹی وی اور موجودہ میڈیا کا مقصد جہاں علمائے دین کی اہانت، دینی اقدار وروایات کو فرسودہ قرار دینا اور نئی نسل کو دین سے نکال کر بے دین بنانا ہے، وہاں تمام شعبوں سے متعلقہ افراد کو بے وقوف بنا کر سرمایہ داروں کی مصنوعات کو فروخت کرنا بھی ہے، جس کے لیے اشتہارات کے جائز وناجائز طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔ ظاہری بات ہے، اربوں کروڑوں روپے کے سرمائے سے قائم کیے گئے ان ٹی وی چینلز کے اخراجات کو اشتہارات کے ذریعہ پورا کیا جاتا ہے۔

اوپر ٹی وی کا جو حقیقی مقصد ہم نے بیان کیا، یہ وہی مقصد ہے جو پاکستان ٹی وی کے یومِ تاسیس سے چند ماہ پیشتر ہونے والی ایک خصوصی نشست میں جو ٹی وی کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالنے کے لیے

بلائی گئی تھی، پی ٹی وی کے جنرل منیجر ذوالفقار علی بخاری نے بیان کیے تھے، جس کو ماہنامہ ''البلاغ'' میں اگست ۱۹۹۴ء کو ''اہم تحقیق بابت پروگرام وپالیسی پاکستان ٹی وی'' کے عنوان سے شائع کیا گیا تھا۔ ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کرنا بالکل بھی مشکل نہیں کہ ٹی وی جیسے مجموعۂ فتن، بلکہ اُم الفتن سے تبلیغ وحفاظتِ دین یا تطہیر نفس جیسا مبارک ومقدس عمل انجام نہیں دیا جاسکتا ہے۔ اس سے تو دین بیزاری، علماء کی بے وقعتی، نئی نسل میں بے دینی کے زہریلے جراثیم، نفس پرستی، خواہشات کی اتباع، حرص وہوس، طمع ولالچ، بے ہودگی وبے حیائی اور دین کی پابندیوں وقیود سے آزادی کی تاریک وادیوں میں پھینکنے کا گھناؤنا عمل ہی انجام دیا جاسکتا ہے اور ایسا کیا بھی جارہا ہے، کیوں کہ یہی ٹی وی کی ساخت اور مقصد کا خاصہ ہے۔

دینی جدوجہد کا روایتی رنگ ڈھنگ

یہی وجہ ہے کہ مدارس اور دعوتِ دین کی محنت کرنے والے حضرات نے آج تک اپنی محنت کا رنگ ڈھنگ روایتی رکھا ہے، کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ دین سیکھنے سکھانے کا ایک ہی طریقہ ہے، جسے نبی اکرم ﷺ لے کر آئے تھے اور وہ نسل در نسل منتقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ اب اس روایتی طریقے کو چھوڑ کر جدید مادی آلات کے ذریعے دین کے علم کا حصول، اس کی روحانیت کا ادراک، تعلیم وتعلم کا نورانی عمل، پاکیزہ جذبات، احساسات اور خیالات کا حصول اور دین کی تبلیغ نہ صرف منہاجِ نبوت کے منافی ہے، بلکہ ایک ڈراؤنے خواب کے سوا کچھ بھی نہیں۔

پھر یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ دین اسلام میں صرف معلومات کی فراہمی اور حصول ہی مطلوب نہیں، وگرنہ ابلیس بھی معلومات کا وسیع ذخیرہ رکھتا ہے۔

لہٰذا جو چیز اپنی وضع سے اپنے تمام تدریجی مراحل اور نت نئی شکلوں میں سراپا شر کے پھیلانے کا باعث ہو، اس سے خیر کے پھیلنے کی توقع بے کار ہے، کیوں کہ یہ بات طے شدہ ہے کہ ''الخیر لا یأتی إلا بالخیر''۔

دین کی تبلیغ اور مادی آلات واسباب

کچھ سال قبل رائے ونڈ کے سالانہ اجتماع کے موقع پر حضرت مولانا سعد صاحب زیدمجدہم (نظام الدین انڈیا والے) نے جو فکرانگیز اور دردآمیز وعظ فرمایا، اس میں یہ بھی فرمایا: ''دعوت کے بارے میں ایک خیال یہ بھی کیا جاتا ہے کہ دین کی تبلیغ کے مادی آلات اور اسباب بہت کثرت سے ہوگئے ہیں، اس لیے اب دعوت الی اللہ کے لیے نقل وحرکت اور خروج کی ضرورت نہیں، دعوت پہنچ چکی ہے اور پہنچ رہی ہے، آپ بھی بیٹھے بیٹھے اپنا پیغام جس جس تک اور جہاں جہاں تک پہنچانا چاہتے ہیں پہنچائیں، اب پھرنے پھرانے کی ضرورت نہیں، حالانکہ حضرت رسول اکرم ﷺ نے اپنے جو خطوط بادشاہوں کو لکھے ہیں، وہ بھی بطور دلیل اور علامت کے لیے تھے، ورنہ آپ علیہ السلام نے اس کے لیے

با قاعدہ جماعت کی نقل وحرکت کو اختیار کیا، جب کہ دعوت سے متعلق تفصیل خطوط میں تحریر فرمادی۔

اسی بیان میں یہ بھی فرمایا کہ: ہماری روزانہ کی کلمہ طیبہ کی دعوت کا مسجد کے ساتھ ایک خاص تعلق یہ ہے کہ لوگوں کو کلمہ طیبہ کی دعوت کے ذریعہ سے غیب کی باتوں کا یقین دلا کر لوگوں کو مادی نقشوں سے نکال کر مسجد کے ماحول میں لا کر ایمان کی مجلسوں میں بٹھایا جائے۔ اُنہیں سرمایہ کاری، تجارت اور دیگر غفلت کے مادی نقشوں سے نکال نکال کر کلمے والے یقین کے ماحول میں لانا ضروری ہے۔ ہمیں غیر کی باتوں کی معلومات ہیں، معلومات کو یقین نہیں کہتے، اس لیے کہ یقین کا تأثر ہوتا ہے، جب کہ معلومات کا کوئی تأثر نہیں ہوتا اور قبر میں زبان معلومات کی بنیاد پر نہیں چلے گی، بلکہ یقین کی بنیاد پر جواب دے گی۔ (الفاروق، صفر المظفر ۱۴۳۰ھ، ص:۷، ۸)

دین کی محنت سے مقصود

غور فرمایئے کہ دین کی محنت سے مقصود لوگوں کے دلوں میں یقین کا پیدا کرنا ہے، نہ کہ ان کو صرف معلومات فراہم کرنا اور یہ کام لوگوں کو ایک معین طریقے سے مسجد کے ساتھ جوڑنے سے ہوگا، اس لیے کہ ہماری تمام محنتوں کا محور و مرکز مسجد و مدرسہ ہے، نہ کہ ٹی وی اور ٹی وی اسٹیشن۔ اب دینی اور ملی ضرورت کے تحت لوگوں کو ٹی وی سے جوڑنے کے باتیں ہورہی ہیں، اس سے لوگوں کو معلومات تو فراہم کی جاسکتیں ہیں، لیکن یقین کی دولت ان کے دلوں میں ٹی وی کے ذریعے نہیں اتر سکتی، جب کہ اصل تو یقین ہی ہے، جس کی بنیاد پر آخرت کی تمام منازل میں کامیابی ملتی ہے۔

پھر اصل مقصد تبلیغِ دین سے یقین کا پیدا کرنا، رجوع الی اللہ، خوفِ الٰہی، تقویٰ وطہارت اور فکرِ آخرت پیدا کرنا ہے، جو آلاتِ لہو ولعب و دیگر آلاتِ شر وفتنہ سے ممکن نہیں۔ تبلیغ دین کے لیے منہاجِ نبوت سے ہٹ کر جو بھی طریقہ اختیار کیا جائے گا، وہ عنداللہ مقبول نہیں، مردود ٹھہرے گا، یہی بات حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہیدؒ نے تصویر کی جدید صورتوں پر گفتگو کے دوران فرمائی تھی کہ یہ بھی کہا جاتا ہے: ''ویڈیو فلم اور ٹی وی سے تبلیغ اسلام کا کام لیا جاتا ہے، ہمارے یہاں ٹی وی پر دینی پروگرام بھی آتے ہیں''۔ لیکن کیا بڑے ادب سے پوچھ سکتا ہوں کہ ان دینی پروگراموں کو دیکھ کر کتنے غیر مسلم دائرہ اسلام میں داخل ہوگئے؟ کتنے بے نمازیوں نے نماز شروع کردی؟ کتنے گناہ گاروں نے گناہوں سے توبہ کرلی؟ یہ محض دھوکا ہے، فواحش کا یہ آلہ جو سرتاسر نجس العین ہے، ملعون ہے اور جس کے بنانے والے دنیا وآخرت میں ملعون ہیں، وہ تبلیغ اسلام میں کیا کام دے گا؟ آخر میں یہ بھی فرمایا: رہا یہ کہ فلاں فلاں یہ کہتے ہیں اور کرتے ہیں، یہ ہمارے لیے جواز کی دلیل نہیں۔ (تصویر اور سی ڈی کے شرعی احکام، ص:۱۲۶، ۱۲۷)

تبلیغ اسلام کا نہج نبوی

عصر حاضر میں گمراہ کن پروپیگنڈوں اور فتنوں کے مقابلے اور تبلیغ اسلام کے لیے جو نہج اختیار

کیا جارہا ہے، کیا عہد نبوی (ﷺ) کے مبارک زمانے میں بھی اس کی کوئی نظیر ملتی ہے یا نہیں؟ جب ہم اس مبارک زمانے کا جائزہ لیتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ کفارِ مکہ مشرکین ومنافقین اور یہود خاص طور پر آنحضرت ﷺ کی ذات اقدس اور عمومی طور پر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف منفی پروپیگنڈے کرتے تھے، مگر حضور اکرم ﷺ نے مسلمانوں کو یہ تعلیم کبھی نہیں دی کہ وہ کفار کی ان مجالس میں جا کر ان پر تنقید کریں، بحث ومباحثہ کریں، جواب وگفتگو میں اُنہی کا طرزِ تخاطب اور انہی کے طور طریقوں کو اپنائیں، بلکہ تعلیم قرآن اور حضور اکرم ﷺ کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی جاہلوں اور اس طرح کے بے سروپا باتیں کرنے والوں سے واسطہ پڑے تو ''عباد الرحمٰن'' کی طرح ''سلامًا'' کہہ کر اعراض کرنا چاہیے۔

چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا اپنے محبوب ﷺ کے مبارک طریقے کے مطابق' کفار ومنافقین کے منفی پروپیگنڈوں کو خاطر میں لائے بغیر دین کی دعوت کو عام کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ مادی وسائل کی کمیابی اور عدم دستیابی کے باوجود دین اسلام کچھ ہی عرصے میں نہ صرف جزیرۂ عرب، بلکہ عالم کے اطراف واکناف میں تیزی سے پھیلنے لگا اور لوگ جوق در جوق اسلام کو قبول کرنے لگے، جب کہ آج ہم مسلمان تعداد اور مادی وسائل واسباب میں اس زمانے سے کئی سو گنا زیادہ اور ترقی یافتہ ہیں، لیکن کیا وجہ ہے کہ ہماری محنت کا کفار پر تو کجا! مسلمانوں پر بھی کوئی خاطر خواہ اثر نہیں ہو رہا؟

ہماری اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی محنتوں میں وہ کونسا بنیادی فرق ہے، جس کی وجہ سے کامیابی نہیں مل رہی؟ اور وہ کونسی خامیاں ہیں جن کی اصلاح کے بغیر مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہو سکتے؟ کیا یہ درست ہوگا کہ ہم ان خامیوں کا پتا لگا کر اُنہیں دور کرنے کی بجائے یہ کوششیں شروع کر دیں کہ اصلاحِ امت کے لیے ان اسباب کو اختیار کیا جائے جن سے خامیوں میں مزید اضافہ ہو؟۔

تعجب ہوتا ہے ان بعض علمی حلقوں کے اس غیر علمی طرز پر جو انہوں نے الیکٹرانک میڈیا کے حوالے سے اپنایا ہوا ہے۔ ان کے نزدیک اجتہادِ جدید یہ بتلا رہا ہے کہ موجودہ دور کے میڈیا خاص کر ''ٹی وی پر آ کر تبلیغ دین اور حفاظتِ دین کا فریضہ سرانجام دینے'' کے معاملے کی نوعیت' لاؤڈ اسپیکر کے واقعے کی طرح ہے کہ ابتدا میں لاؤڈ اسپیکر پر بھی مختلف اعتراضات کیے گئے اور اس کے استعمال سے روکا گیا، لیکن بعد میں تمام حضرات اس کی افادیت وجواز کے قائل ہو گئے۔

قیاس مع الفارق

صرف ظاہری مماثلتوں کی بنیاد پر ایک چیز کو دوسری چیز کی طرح قرار دینا اور دونوں میں اختلاف کی نوعیت کو یکساں ظاہر کرنا ایک غیر علمی طرز ہے، کیوں کہ موجودہ آلات، میڈیا اور ٹی وی وغیرہ لاؤڈ اسپیکر کے برخلاف ایک آلہ نہیں، ایک مکمل نظام ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کا حصہ ہے، جس کے اپنے مقاصد واہداف ہیں، اور وہ کسی بھی صاحب عقل پر مخفی نہیں۔

اور اگر دونوں کوایک ہی مان لیا جائے اور ان حضرات کے قیاس کو بلا چوں وچرا تسلیم کرلیا جائے، تو پھر ان تمام قیاسوں کو بھی ماننا پڑے گا، جن کا ظہور بعض ناعاقبت اندیشوں کے جدید اجتہادات کا مرہونِ منت ہے۔ یہ تو ایسے ہی ہوگا جیسے کوئی شخص صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جہاد کی تیاری کے سلسلے میں کی گئی گھڑ دوڑ اور نیزہ بازی اور دیگر جنگی مشقوں کی بنیاد پر جدید دور کے اولمپک گیمز اور دیگر عالمی کھیلوں کے مقابلوں کو بھی سندِ جواز فراہم کرے، یا صحابہ کرامؓ کے میدانِ جنگ میں پڑھے گئے رجز یہ اشعار، طبل جنگ اور عام حالات میں پڑھے گئے حمد یہ کلمات اور خوشی کے مواقع پر بچیوں کے دف بجانے اور اشعار کہنے کو بنیاد بنا کر آج کے آرٹ کلب اور موسیقی کو جائز کہنے لگے یا موجودہ کامیڈی کو جائز کہنے کے لیے اس صحابیؓ کا فعل بطور دلیل پیش کرے، جو رسول اکرم ﷺ کی فرحت طبع کی خاطر کبھی مزاح کرلیا کرتے تھے۔

اگر قیاس کا یہ معیار درست قرار پایا تو پھر اس قسم کے نام نہاد متجد دین روحِ شریعت کو مسخ کرکے تمام باطل نظریوں، غلط طریقوں اور آج کل کی تمام غلاظتوں کو جواز کی شرعی سند فراہم کرنے کے لیے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے کسی نہ کسی عمل پر قیاس کرنا شروع کردیں گے تو کیا ہمارے محترم علمائے کرام ان کے اجتہادات بلاکم وکاست قبول فرمالیں گے؟

نااہل سے علمی گفتگو کا حکم

ملی اور دینی ضرورت ومصلحت کے تحت میڈیا کے استعمال کو ناگزیر بتانے والے حضرات ان اسلامی تعلیمات سے بھی یقیناً آشنا ہوں گے، جن میں مخاطب کوسامع کے احوال کی رعایت رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ بالفرض اگر کوئی اس نئے اجتہاد کی بنا پر ٹی وی پر آنے کو جائز بتائے تو کیا وہ سامعین کے مستوائے ذہنی کی رعایت کرپائیں گے؟ تجربہ اور مشاہدہ سے پتا چلتا ہے کہ آج تک اس حوالے سے کیے گئے تجربات سے عوام کے ذہنوں میں شکوک وشبہات کے زہریلے جراثیم نے ہی پرورش پائی ہے۔ اب بھی اگر اس تجربے کو دہرایا گیا تو غالب گمان یہی ہے کہ بجائے مسلمانوں کے عقائد ونظریات کی حفاظت کے، ان کو مزید فتنوں میں مبتلا کردیا جائے گا، وہ مزید الجھنوں کا شکار ہوجائیں گے۔ اوٹ پٹانگ مباحثوں میں پڑکر یقین کی قیمتی دولت سے ہاتھ دھوبیٹھیں گے۔ سنن دارمی کی ایک روایت میں حضور اکرم ﷺ کا مبارک ارشاد ہے: ''نااہل سے علمی گفتگو نہ کرو، ورنہ وہ تمہیں جاہل کہے گا، علم ہو یا دولت تم پر دونوں کے حقوق ہیں''۔ مسلم شریف کی ایک روایت میں اس مضمون کو یوں بیان کیا گیا ہے: ''جب تم لوگوں کے سامنے ایسی گفتگو کرو جو اُن کی عقل کی رسائی سے باہر ہو، تو وہ کچھ لوگوں کے لیے فتنہ بن جائے گی۔'' (الصحیح للامام مسلمؒ، باب النہی عن الحدیث بکل ماسمع: ۱/۱۱، دارالکتب العلمیۃ) اسی طرح بخاری شریف میں ہے: ''عوام کو ان کی عقل کے مطابق مسائل بتاؤ''۔ (الصحیح للامام البخاری، کتاب العلم، ص: ۲۷، دارالسلام)

پس ان احادیث سے یہ بات خوب واضح ہوجاتی ہے کہ لوگوں کے مستوائے ذہنی کی

رعایت کے بغیر شرعی معاملات میں گفتگو کرنا فکری انتشار اور عوام کو دینیات میں گفتگو کرنے کی اجازت دینے جیسے خطرناک مفاسد کا ذریعہ بنتا ہے۔

دینی نقصانات کے غالب اندیشے

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

’’نیکی کے جس کام میں نفس کی خواہش شامل ہو جائے، وہ اتنا لذیذ ہوتا ہے جس طرح مکھن کے ساتھ شہد ملا لیا جائے۔‘‘

آج جہاں حبِ مال وحبِ جاہ اور اپنی رائے کو حرفِ آخر سمجھنے کا دور دورہ ہے، اگر ٹی وی کے ذریعے تبلیغ دین اور حفاظتِ دین کی اجازت دی گئی تو بجائے فائدے کے نقصان کا غالب اندیشہ ہے کہ کہیں مخاطبین عجب، تکبر، ریا اور اپنی رائے کو حرفِ آخر سمجھنے کے باطنی امراض میں مبتلا نہ ہو جائیں اور ممکن ہے کہ ابتدا میں کچھ مخلص لوگ اس طریقے کو اپنے زیرِ اثر رکھنے کی کوشش کریں، لیکن ایسے معاملات ومواقع پر عموماً کنٹرول ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہوتا ہے جن کو اسلام اور مسلمانوں کی خیرخواہی سے بڑھ کر اپنی عزت زیادہ عزیز ہوتی ہے، ان کے سینوں میں علم سے بڑھ کر دولت و مادیت ڈیرا ڈال چکی ہوتی ہے۔

ٹی وی پر تبلیغ دین کے مفاسد میں سے ایک مسلمہ نقصان یہ بھی ہے کہ جب کوئی ٹی وی چینل ’’اسلامک‘‘ کا لیبل لگا کر اپنی نشریات پیش کرے گا تو غریب عوام یہی سمجھے گی کہ یہاں کوئی دارالافتاء قائم ہے اور فتویٰ دینے والے ماہر مفتی حضرات تحقیقی جواب دیں گے، جب کہ حقیقت حال اس کے برعکس ہونا عین ممکن ہے، کیوں کہ ٹی وی پر پیش کیا جانے والا ہر پروگرام برائے استفتا نہیں ہوسکتا اور نہ ہی وہاں کسی ماہر مفتی کی موجودگی یقینی ہے، لہٰذا ’’اسلامک‘‘ کے لیبل کی وجہ سے ہر وہ شخص جو علماء کی جماعت کی طرف منسوب کر کے اس پروگرام میں سامنے لایا جائے گا، اس سے عوام طرح طرح کے سوالات براہِ راست پوچھنا شروع کریں گے، جب کہ ہر سوال از روئے قواعدِ افتاء قابلِ جواب وقابلِ اعتناء نہیں ہوتا اور نہ ہر سوال کا جواب متحضر ہوتا ہے۔ لیکن کیا ٹی وی پر موجود کوئی بھی مفتی اپنے علمی تبحر کو ’’لا أدری‘‘ کی تلوار سے کاٹ سکے گا؟ یا کسی تحقیق طلب سوال کے جواب میں تأمل وتردد کا مظاہرہ کر کے اپنے اعتماد کو کھونا گوارا کر سکے گا؟ ہوسکتا ہے وہ کسی ’’مصلحت‘‘ کی بنا پر سائل کو مطمئن کرنے کے لیے فوری جواب دے اور پھر اٹکل پچو سے جوابات دینے کا ایک مضحکہ خیز سلسلہ چل پڑے گا، جو تبلیغ تو نہیں البتہ علماء سے عوام کا اعتماد اٹھانے میں کافی معاون ہوگا۔ مجوزین حضرات اس پہلو پر بھی غور فرمالیں۔

یہاں یہ بات بھی یقینی ہے کہ جواز کے فتوے سے وہ تمام حلقے بھرپور فائدہ اٹھائیں گے جو مضبوط اور ٹھوس علم سے عاری ہیں اور دو چار اُردو عربی کی کتابوں سے معدودے چند معلومات کو کل دین کا علم سمجھتے ہیں، وہ اس فتویٰ کی آڑ میں ایسے مسائل ودلائل بیان کریں گے جن سے اصلاحِ نفس،

حفاظتِ دین اور تصفیۂ عقائد کی بجائے افساد و اضلال کا کام ہوتا رہے گا۔ اُس وقت میڈیا کے شور و غوغا کا وہ عالم ہوگا کہ علمائے مخلصین کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز کی طرح سنائی نہ دے گی۔

پھر وہ مفکرین جو ہر مسئلے میں متبادل کی رَٹ لگاتے پھرتے ہیں، اس بات کی کیا ضمانت دیں گے کہ جو چند گھر ٹی وی کی غلاظتوں سے پاک ہیں، جب ان کے جواز کے فتوے کی بدولت یہ لعنت ان کے گھروں میں بھی آجائے گی تو وہاں صرف دینی معلومات پر مشتمل پروگرام ہی دیکھے جائیں گے؟ ایمان سوز، فحاشی، بے حیائی و بے دینی پر مشتمل پروگرام نہیں دیکھے جائیں گے؟ کیا گھر میں اس ملعون آلے کے آجانے کے بعد جائز و ناجائز کی تحقیق ثانوی درجہ میں نہیں چلی جائے گی؟ نفس امارہ اور شیطان کی اغواکاری اپنا کام دکھانا شروع نہ کردے گی اور کیا اس سے گناہ اور بدکاری کی راہ نہ کھل جائے گی؟

ٹی وی پر اسلامی نشریات کا حکم

حضرت مفتی رشید احمد صاحب قدس سرہٗ ''ٹی وی پر اسلامی نشریات سننا بھی حرام ہے'' کے عنوان سے تحریر فرماتے ہیں:

> ''ٹی وی جیسے آلۂ لہو ولعب، بے دینی، فواحش اور منکرات کے مرکز پر دینی پروگرام دکھائے جاتے ہیں اور انہیں اشاعت اسلام کا نام دیا جاتا ہے، یہ دین کی سخت بے حرمتی اور مسلمان کے لیے ناقابل برداشت توہین ہے۔ کوئی کتنا ہی اہتمام کرے کہ صرف جائز اشیاء ہی دیکھے گا تب بھی ناممکن ہے۔ اگر بطور فرض ومحال تسلیم کرلیا جائے کہ کسی حرام کے ارتکاب کے بغیر صرف جائز اشیاء کا دیکھنا ممکن ہے تو بھی اس میں یہ فساد ہے کہ شروع کرنے کے بعد اس کا شوق اور نشہ اتنا بڑھے کہ حرام اشیاء کے دیکھنے تک پہنچا کر چھوڑے اور ہر وہ کام جو حرام تک پہنچنے کا ذریعہ ہو حرام ہے، اگرچہ وہ فی ذاتہٖ مباح ہو۔ ''**الأمر المفضی إلی الحرام حرام**''۔ (احسن الفتاویٰ: ۸/ ۳۰۵، طبع: ایچ ایم سعید)
>
> ''کوئی دین دار شخص محرمات سے بچ کر ٹی وی دیکھنے کی کوشش کرے تو عوام اس سے ٹی وی کی مطلقاً اباحت پر استدلال کریں گے''۔ (احسن الفتاویٰ، ۸/ ۲۰۰، ۲۰۱، ط: ایچ، ایم سعید)

اگر کوئی یوں کہے کہ ہمارا کام تو صحیح بات بتانا ہے، باقی کوئی غلط پروگرام دیکھے تو وہ اس کا اپنا ہی قصور ہوگا۔ ٹھیک ہے، قصوروار تو وہ ہوں گے، لیکن سبب تو وہی جواز کا فتویٰ دینے والے ہی بنیں گے۔ اب بھی عوام کو دوسرے مخربِ اخلاق اور دین وایمان کو برباد کرنے والے چینلوں سے روکنا مشکل بلکہ تقریباً ناممکن ہے، تو جواز کا فتویٰ دے کر کیوں ملی اور دینی ضرورت کے نام پر مغرب کے ناپاک عزائم کی تکمیل کا ذریعہ بنیں اور کیوں ان کے اس مشن کا حصہ بنیں؟ جس کا مقصد ایک ایسا ماحول و مزاج پیدا کرنا ہے، جہاں رنگینیوں، ہلے گلے اور موج مستیوں کو بھی دین کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔

دوسروں کی اصلاح کی خاطران کے دین وایمان کو بچانے کے لیے خود کو گمراہی میں مبتلا کیا جائے اور دوسروں کو گناہ کی اجازت دے کر اپنی آخرت بگاڑ لی جائے۔ اسلام کی چودہ سو سال سے زائد تاریخ میں اس طرح کی کوئی ایک مثال بھی نہیں ملتی، دوسروں کو اس کے بارے میں دعوتِ فکر دینا کہ وہ بھی جواز کی کوئی صورت نکالیں ممکن نہیں، کوئی بھی عقل منداس کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوگا۔

بے ادب ہمیشہ بے نصیب

دین سیکھنے سکھانے سے آتا ہے، یہ ایسا عمل ہے جس میں فریقین کی محنت کے ساتھ اخلاص بھی انتہائی ضروری ہے۔ دین مشقتوں اور قربانیوں سے آیا ہے، اس کی حفاظت بھی قربانیوں کے ذریعے کی گئی ہے اور آئندہ بھی دین کی اشاعت وحفاظت مجاہدے اور قربانیوں ہی سے ممکن ہے۔ تعلیم وتعلم کے اس مبارک عمل میں مجاہدے کے ساتھ صبر، وقار اور ادب بھی نہایت ضروری ہے۔ بے ادب ہمیشہ بے نصیب ہوتے ہیں، تصور کریں وہ کیا منظر ہوگا! جب ایک عالم دین برسوں کی محنت سے حاصل شدہ علم اسکرین پر آ کر بیان کرے گا اور ایک شخص اپنے بستر پر لیٹے ہوئے یا کرسی یا صوفے پر ٹانگیں لمبی کر کے، پہلو بدل بدل کر، کھاتے پیتے اس دینی پروگرام کو دیکھے گا، ذرا بتایئے تو سہی! اس کیفیت اور انداز سے پروگرام دیکھنے والے کے عقائد ونظریات میں پختگی آئے گی یا بے ادبی کی وجہ سے وہ مزید محرومیوں کی کھائیوں میں گرتا چلا جائے گا؟

اگر اہل علم ملی جذبے اور دینی مصلحتوں کے پیش نظر اسکرین کے مباحثوں اور مذاکروں میں حصہ لینا بھی شروع کردیں تو کیا یہ ممکن ہے کہ یہود اور ان کی روحانی اولاد علماء کے افکار وارشادات کو ان کی مرضی کے مطابق بیان کرنے کی اجازت دیں گے؟ کچھ عرصہ قبل ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم کے ساتھ ایک آیت کے شانِ نزول کے بیان کے بعد کیے گئے سلوک سے کون واقف نہیں؟ یہ اسکرین ہی کا کمال ہے کہ ایک بات جو صدیوں سے مسلَّم ہے اور کتابوں میں نقل در نقل چلی آ رہی ہے، اس کو بیان کرنے والا عوام سے مجرموں کی طرح معافی مانگتا ہے، کیوں کہ یہ بات عوام یا بعض گمراہ فرقوں کے مزاج کے خلاف بیان کی گئی ہے۔ یہ تو ایک واقعہ ہے، اس طرح کے کئی واقعات ہوئے ہیں، جن میں علماء کو بدنام کیا گیا یا قصداً ان کے موقف کو من وعن عوام کے سامنے پیش کرنے سے احتراز کیا گیا۔

بعض علماء کی نئی تحقیق

حضرت مفتی رشید احمد لدھیانویؒ کا ایک اور ارشاد ملاحظہ فرمائیں، جس میں حضرت والا ماضی کے چند گمراہ مفکرین کے سینما کو جائز کہنے پر گفتگو کے بعد فرماتے ہیں:

''اب یہی حال بعض علماء کی اس نئی تحقیق کا ہے کہ ویڈیو تصویر (یا ڈیجیٹل تصویر) کو چوں کہ قرار وبقا نہیں، اس لیے یہ تصویر نہیں، اس سے وہ افراد جو ٹی وی وغیرہ کو ناجائز

سمجھ کر اس سے گریزاں وترساں تھے، ان کو اس گنجائش سے کھلی چھوٹ مل گئی اور وہ ناجائز ومنکرات سے پاک مناظر کو دیکھنے کے بہانے رفتہ رفتہ ہر غلط پروگرام، رقص وسرود اور عریانی وفحاشی کے مناظر دیکھنے میں مبتلا ہورہے ہیں، اس کا محض امکان نہیں، بلکہ وقوع ہے کہ بعض بظاہر دین دار لوگوں نے مسلمانوں کی مظلومیت اور جہاد کے مناظر دکھانے کے بہانے ٹی وی اور وی سی آر خریدا اور پھر ہر فحش ڈراما اور فلم دیکھنے کے عادی ہوگئے۔ اس طرح نوجوان نسل دنیا وآخرت کی تباہی کا شکار ہورہی ہے اور بعض مخلص دینی جماعتوں اور جہادی تنظیموں سے منسلک نوجوان اپنے اندر دین وجہاد کا جذبہ پیدا کرنے کی بجائے بے راہ روی اور غلط روش کا شکار ہورہے ہیں، جس سے دین وجہاد کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے''۔ (احسن الفتاویٰ، مسائل شتیٰ: ۹/۹۰، ط: ایچ، ایم سعید)

اکابر کی بصیرت

ذرا غور فرمائیں! یہ تحریر ۱۷ر سال قبل ۲۰ر جمادی الثانیۃ ۱۴۱۷ھ کی ہے، اللہ جزائے خیر دے ہمارے اکابر کو جن کی بصیرت افروز اور دوررس نگاہوں نے آنے والے فتنوں اور ان کی سنگینیوں کو نہ صرف محسوس کیا، بلکہ ان کے سدِ باب کے لیے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر ہماری رہنمائی کے لیے اپنی تحریرات میں بہت مواد فراہم کیا اور وہ لوگ جو بظاہر دین داری کا لبادہ اوڑھ کر، مسلمانوں کی مظلومیت کا رونا روکر اور جہاد کے مقدس عمل کے مناظر دکھانے کے بہانے الیکٹرانک میڈیا کو'' ملی اور دینی ضرورت'' کے خوب صورت عنوان کی سندِ جواز فراہم کرتے ہیں، ان کے مزعوماتِ باطلہ کو بھی یہ کہہ کر رد فرمایا کہ اس سے دین اور جہاد کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے۔ بعض حضرات حضرت مولانا مفتی نظام الدین شہیدؒ کے بعض مبہم اقوال سے جواز کے لیے استدلال کرتے ہیں، وہ ذرا عبرت کی نگاہ سے حضرت شہیدؒ کی اس بات کو بھی پڑھیں، طالبان کی حکومت کے دور میں حضرت مولانا مفتی نظام الدین شہیدؒ اس قسم کے ایک مکالمے میں شریک ہوئے، تو انہوں نے خود بتایا کہ میزبان پہلے تو مجھے بولنے نہیں دے رہا تھا، جب میں نے بولنا شروع کیا تو اس نے بار بار میری بات کاٹنے کی کوشش کی، لیکن جب میں نے اس پر برہمی کا اظہار کیا تو اگرچہ اس نے مداخلت بند کردی، لیکن انٹرویو کے وہ حصے جو حکومت اور بین الاقوامی قوتوں کے ذوق کے خلاف تھے، حذف کردیئے گئے۔

چنانچہ مفتی صاحبؒ نے خود فرمایا کہ: میں نے سوچا تھا، شاید اس طرح عوام کے سامنے حقائق آجائیں گے اور اسی لیے میں شریک بھی ہوا تھا، مگر بعد میں اندازہ ہوا کہ میری سوچ صحیح نہیں تھی اور ایسے پروگراموں میں شریک ہونا درست نہیں، کیوں کہ ان انٹرویوز کا مقصد حقائق کی نشان دہی نہیں، بلکہ حقائق کو مسخ کرنا ہوتا ہے۔ ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ ہم اپنا چینل چلاکر اپنی مرضی سے حقائق بیان کریں گے،

کیا یہود اور بین الاقوامی ملتِ کفر یہ اس چینل کو چلنے دیں گے؟ نہیں ، ہرگزنہیں ! الجزیرہ ٹی وی کے پروگراموں کی روک تھام تمام دنیا کے سامنے ہے، عبرت حاصل کرنے کے لیے یہ واقعات کافی ہیں۔

ٹی وی کے مذہبی بنیادوں پر اثرات

ٹی وی کس طرح مذہبی بنیادوں پر اثر انداز ہوتا ہے، اس کا عملی ثبوت مصر اور عرب ممالک ہیں، آج وہاں کی جوصورت حال ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اپنوں کو چھوڑ کر غیر مسلموں میں بھی جو لوگ مذہب پرست اور راسخ العقیدہ کہلاتے ہیں، انہوں نے جب ٹی وی کے ذریعے عوام کو اپنا پیغام پہنچانے کی فکر کی اور اس سلسلے میں عملی اقدامات کیے تو وہی لوگ وقت گزرنے کے ساتھ گناہ کے ان تمام کاموں پر راضی ہوئے، جن کے وہ کبھی بھی قائل نہ ہو سکتے تھے، چنانچہ ''اویخ لیکل'' نامی عیسائی فرقے کا ''گراہم بلی'' جو بنیادی طور پر نہایت متشدد عیسائی تھا، اس کی دعوت کا بنیادی نقطہ گناہوں سے بھری امریکی معاشرت سے بغاوت تھا۔ یہی ''گراہم بلی'' جب اپنے نقطۂ نظر کو ٹی وی کے ذریعے عوام تک پہنچانے کی عملی کوشش میں مصروف ہوا تو رفتہ رفتہ وہ نہ صرف گناہوں سے بھری امریکی معاشرت پر راضی ہوا، بلکہ صدر اور مونیکا جیسے کیس کو بھی بہت سہولت سے ہضم کر گیا، نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ایک متشدد مذہبی رہنما کی بجائے امریکی صدر کا خواجہ سرا دکھائی دینے لگا۔

اس بات سے بھی کسی کو انکار نہ ہوگا کہ جواز کے فتویٰ کے بعد تقویٰ وصلاح کا معیار سلف صالحین کی اتباع کی بجائے عوامی مقبولیت قرار پائے گا۔ علمائے ربانیین جن کی زندگیاں علم وعمل میں بیت گئیں، ان کو بے وقعت اور ان کے علم کو غیر معیاری قرار دیا جائے گا، جو بھی اسکرین پر آئے گا تو وہ بہت بڑا عالم کہلائے گا، اس کی اُلٹی سیدھی باتیں حقیقی علم سمجھی جائیں گی، یہ کتنے بڑے نقصان کی بات ہے؟ اس کے تصور سے ہی رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔

اخف الضررین یا اشد الضررین؟

یہ بھی کہا جارہا ہے کہ ٹی وی پر آنے کو اخف الضررین کے تحت گوارا کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ معاملہ اس کے برعکس ہے کہ ٹی وی پر آنا اشد الضررین ہے اور نہ آنا اخف الضررین ہے، اس لیے کہ چند فی صد لوگ ہیں جو ٹی وی کے وبال سے محفوظ ہیں اور اپنے عقائد ونظریات کی حفاظت اور عملی زندگی میں مسائل کے حوالے سے علماء سے براہِ راست رابطہ رکھتے ہیں اور استفادہ کرتے ہیں، جواز کے فتوے کے بعد ٹی وی کی لعنت میں ان کے بھی مبتلا ہونے کا قوی اندیشہ ہے۔ باقی لوگ جو اپنی زندگی گزارنے میں خود کو خود مختار خیال کرتے ہیں اور علماء کو اپنی ترقی میں رکاوٹ سمجھتے ہیں، ٹی وی کے مباحثوں سے ان کی اصلاح اور ان کے عقائد ونظریات کا درست ہونا ایک امر موہوم ہے، لہٰذا ہم یہ کہتے ہیں کہ اخف الضررین والے قاعدہ کے تحت ٹی وی پر نہ آنے کو برداشت کیا جائے۔

فنی باریکیاں اور اسلام

جدید تحقیقات کے حوالے سے اسلام کا مزاج یہ ہے کہ وہ کسی بھی شئے کی فنی باریکیوں اور سائنسی تحقیقات پر حکم کا مدار نہیں رکھتا، اس لیے کہ سائنس کی آج کوئی تحقیق سامنے آتی ہے تو اگلے دن وہ تنقید کی نذر ہوکر غلط بھی قرار پاسکتی ہے، اگر بنیاد سائنسی اور فنی باریکیاں بن جائیں تو اسلام ایک کھیل بن جائے گا، جس کا جی چاہے گا تحقیق کے بدلنے کا بہانہ کرکے اسلامی احکام میں تبدیلی کا خواہاں ہوگا۔

اس اعتراض سے بچنے کے لیے بعض لوگوں نے فنی باریکیوں کی طرح الفاظ کے پیچوں میں گتھی کو مزید سلجھانے کے لیے یہ کہا کہ ہم نے بنیاد سائنسی تحقیق پر نہیں، بلکہ ماہرین سے حقیقت معلوم کرکے اس پر رکھی ہے۔ لیکن نتیجہ وہی نکلے گا کہ پھر تو اپنے مطلب کی بات ثابت کرنے کے لیے ہر آدمی یہی کہنا شروع کردے گا کہ ہم نے حقیقت معلوم کرکے حکم لگایا ہے، لہٰذا اس سے نام نہاد دینی اسکالرز اور متجددین کو اپنے اجتہاد کی صحت کو ثابت کرنے کے لیے ایک مضبوط سہارا ہاتھ آئے گا۔ اس کے لیے علماء حق کبھی تیار نہیں ہوں گے۔

اس کے باوجود اگر کسی کا زیادہ اصرار ہے کہ حقیقت معلوم کرنے کے بعد حکم لگایا جاسکتا ہے تو پھر اس سے یہ کہا جائے گا کہ وہ معاملات جن کا تعلق براہ راست مسلمانوں کے فائدے اور ضرر سے ہو، ان میں مسلمان ماہرین کی رائے معلوم کی جائے، تاکہ وہ معاملے کی نزاکت اور نوعیت کو مدنظر رکھتے ہوئے صحیح اور حقیقی صورت حال سے آگاہ کریں۔

ماہرین کی رائے

اس سلسلے میں مسلمان ماہرین متفق ہیں کہ ڈیجیٹل کیمرے کی تصاویر اور ہاتھ کی بنی ہوئی تصاویر میں کوئی فرق نہیں۔ چنانچہ ''ڈیجیٹل تصویر اور سی ڈی کے شرعی احکام'' میں جناب علیم احمد صاحب (مدیر ماہنامہ گلوبل سائنس) اور جناب تفسیر احمد صاحب (سینئر ڈیولپمنٹ انجینئر ادارہ تحقیقات اردو نیشنل یونیورسٹی آف کمپیوٹر ایمرجنگ سائنس لاہور، حال پی ایچ ڈی یونیورسٹی جرمنی) نے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ ڈیجیٹل اور دوسری تصاویر میں کوئی فرق نہیں، سب ''تصویر محرم'' ہی کے حکم میں ہیں۔

ٹی وی کو سندِ جواز فراہم کرنے کے تدریجی مراحل

تصویر کو جائز قرار دے کر ٹی وی چینل کے جواز کو سند فراہم کرنے کا عمل تدریجاً اختیار کیا گیا ہے، شروع میں تمام علماء ٹی وی سے متعلقہ تمام امور حتیٰ کہ اُسے دیکھنے والے کی امامت کے عدمِ جواز اور ٹی وی کی مرمت کی اجرت کو بھی ناجائز وحرام کہتے تھے، جس کا واضح ثبوت اکابر کے فتاویٰ اور تصویر اور ٹی وی سے متعلق ان کے مضامین ہیں۔

پھر یہ موقف اپنایا گیا کہ ڈیجیٹل کیمرے سے لی جانے والی تصویر کو تصویر کہنے میں تأمل وتردد ہے، پھر عرصے کے بعد یہ کہا گیا کہ اسکرین پر آنے والی تصاویر کی تین صورتیں ہیں، کچھ جائز اور کچھ ناجائز ہیں۔ پھر اس پر اعتراض ہوا کہ اکابر کے قدیم فتاویٰ کی تردید ہو جائے گی، تو یہ موقف اپنایا گیا کہ اکابر کے سابقہ فتاویٰ کو ’’سداً للذرائع‘‘ برقرار رکھا جائے اور علمائے کرام کو ضرورت کی وجہ سے ٹی وی کے پروگراموں میں شرکت کی اجازت دی جائے، تو اب نئی تحقیق یہ پیش کی گئی کہ ڈیجیٹل کیمرے کی تصویر تصویر ہی نہیں، نہ ہی شبیہ ہے، بلکہ اشبہ بالعکس ہے۔

نئی مصیبت

دینی اور ملی جذبے کے تحت ہمارے اکابر اس طرح کی تحقیقات پیش کر سکتے تھے، لیکن اللہ جزائے خیر دے اُنہیں، وہ سمجھتے تھے کہ جس مصیبت میں مصر والے مبتلا ہو گئے ہیں، وہ بھی اسی طرح کی تحقیقات کا نتیجہ تھا، اس کے برعکس ہمارے اکابر نے صاف اور واضح الفاظ میں ان مجتہدین کی تردید کی، جنہوں نے مشینی ترقی کی وجہ سے چیزوں کے نام بدل کر ان کو جائز کر ڈالا۔ چنانچہ تصویر ہی کے حوالے سے بحث کرتے ہوئے مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہٗ تحریر فرماتے ہیں:

> ’’اس وقت ایک نئی مصیبت اس مشینی دور نے کھڑی کر دی کہ جو چیزیں پہلے دستی صنعت سے بنائی جاتی تھیں، اب وہ مشینوں کے ذریعے پہلے سے زیادہ صاف ستھری اور جلد سے جلد بن کر تیار ہوتی ہیں، ان مشینوں کے ذریعہ تیار ہونے والی چیزوں کے عموماً نام بھی الگ رکھ دیئے گئے، جن چیزوں کو شریعت اسلام نے کسی خاص نام اور عنوان سے حرام کیا تھا، اب وہ نام وہ عنوان نہ رہا، تو کچھ لوگوں نے اس کو حیلۂ جواز بنالیا۔‘‘ (تصویر کی شرعی احکام، ص:۵۷)

حضرتؒ کی اس تحریر اور دیگر تحریروں سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ مشینی ترقی اور ناموں کی تبدیلی سے احکام نہیں بدلتے، اگرچہ کچھ لوگ مشینوں کی نت نئی شکلوں کے وجود میں آنے اور ناموں کی تبدیلی سے فائدہ اٹھا کر ان کے حکموں میں بھی تبدیلی کے خواہاں نظر آتے ہیں۔

جدید مصنفین کا حیلہ

وہ احادیث جن سے تصاویر میں رخصت معلوم ہوتی ہے، ان کے بارے میں حضرت مفتی محمد شفیعؒ تحریر فرماتے ہیں:

> ’’مگر آج کے جدید مصنفین نے ان حادیثِ رخصت کو عام تصاویر کی حلت کا حیلہ بنالیا ہے اور ایک نیا حیلہ تو ایسا ایجاد کیا گیا ہے جس کی وجہ سے یہ تصاویر کی ساری ہی

بحث ختم ہوجاتی ہے، وہ یہ کہ آج کل جس طرح تمام مصنوعات جو پہلے زمانے میں دستی بنائی جاتی تھیں، اب مشینوں اور آلات کے ذریعے بنتی ہیں، اسی طرح تصاویر سازی کے فن کو اس مشینی دور نے ترقی دے کر فوٹوگرافی اور عکاسی (اس وقت کے مقابلے میں اب ڈیجیٹل کیمرے بھی وجود میں آ گئے ہیں) کی صورت دے دی ہے، بعض علمائے مصر نے اور پھر بعض علمائے ہند نے بھی اس کے متعلق یہ فرمادیا: کہ فوٹو (اور اب ڈیجیٹل کیمرے) کے ذریعے جو تصویر لی جاتی ہے وہ تصویر کے حکم میں نہیں، وہ تو ایک سایہ ہے جیسے آئینہ اور پانی میں انسان کی شکل دیکھی جائے، اس کے حرام و ناجائز ہونے کے کوئی معنی ہی نہیں''۔ (تصویر کے شرعی احکام، ص:۱۰۳)

حضرت مفتی صاحبؒ کا یہ ارشاد بھی متجددین حضرات کو دعوتِ فکر دے رہا ہے کہ وہ بعض علماء مصر کا طرزِ عمل اپنانے سے گریز کریں، ورنہ دنیا میں ہونے والے تمام کام جائز ہوجائیں گے۔ کوئی برائی' برائی نہیں رہے گی، بلکہ تمام برائیاں اچھائیاں بن جائیں گی، فرمایا:

''اسی طرح بعض لوگ یہ چاہتے ہیں کہ علمائے ہند مثل بعض علمائے مصر کے کرنے لگیں، ان بعض علماء نے ایسا کر رکھا ہے کہ جو دنیا میں ہورہا ہے، سب جائز! تو یہاں کے لوگ بھی یہی کرانا چاہتے ہیں علماء سے۔'' (تصویر کے شرعی احکام، ص:۱۰۳)

اسی بحث کے بالکل اخیر میں ارشاد فرمایا:

''مسئلہ زیر بحث یعنی مسئلہ تصویر بھی اس عام ضابطہ سے خارج نہیں ہوسکتا، جیسا کہ ان شاء اللہ! اس رسالہ کے آخری باب میں ملاحظہ فرمائیں گے کہ باوجود اس عالم گیر وباء کے جو تصاویر کی صورت میں پھیلی ہے اور بظاہر دنیا کا کوئی کام اس سے بچا ہوا نہیں، لیکن اس وقت بھی اگر کوئی شخص شرعی فتویٰ کی پابندی کرنا چاہے تو اس کا کوئی ضروری مقصد فوت نہیں ہوتا۔ (تصویر کے شرعی احکام، ص:۱۰۷)

حضرتؒ سے یہ سوال کیا گیا کہ ٹی وی کے ذریعہ علماء کرام کی تقاریر، نعتیں اور قرآن مجید کی تلاوت سنائی جاتی ہیں، غرض یہ بڑوں اور بچوں کی تعلیم وتربیت کا بہترین ذریعہ ہے، کیا ان فوائد کے پیش نظر ٹی وی رکھنا یا دیکھنا شرعاً درست ہے؟ آپؒ نے جواب میں تحریر فرمایا:

''ٹی وی کی تباہ کاریاں کسی ذی ہوش انسان پر مخفی نہیں، موجودہ معاشرے میں ٹی وی کا کردار دیکھتے ہوئے بھی کوئی شخص اس کے منافع گنوانے پر مصر ہے تو اس کی مثال اس احمق سے مختلف نہیں، جس کے سامنے آگ کا الاؤ جل رہا ہے، اس کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے ہیں اور اس کی لپٹ اردگرد کی ہر چیز کو جھلسائے دے رہی ہے، عقل مند لوگ تو یہ منظر دیکھ کر دور دور بھاگ رہے ہیں، مگر

یہ ڈھٹائی سے کھڑا آگ کے منافع گنوا رہا ہے اور پکار پکار کر کہہ رہا ہے: مجھے یا تو قائل کرو، ورنہ میں بیوی بچوں سمیت اس دہکتی آگ میں کود جاؤں گا، ایسے شخص کو کیا جواب دیا جائے؟ سوائے اس کے کہ اپنے دماغ کا علاج کراؤ''۔

چشم دید حقیقت

''غرض ٹی وی کے مفاسد اور اس کی زیاں کاریاں کوئی نظریاتی مسئلہ نہیں کہ دلائل کے ذریعہ اُسے سمجھایا جائے، یہ ایک چشم دید حقیقت اور سامنے کی بات ہے کہ ٹی وی کی لعنت انسانی معاشرے کے صحت مند ڈھانچے کو ٹی بی کی طرح تلپٹ کیے جارہی ہے، مگر افسوس کہ اس کی رنگینیوں نے اچھے بھلے لوگوں کی نظروں کو خیرہ کر دیا ہے۔'' (احسن الفتاویٰ، کتاب الحظر والاباحۃ، ۸/۲۸۹، طبع: ایچ، ایم سعید)

اس حوالے سے مزید تحریر فرماتے ہیں:

''اگر اُسے عکس تسلیم کر کے ہم جائز قرار دیں تو خارجی مفاسد کی بنا پر ایک جائز کام بھی ناجائز ہوتا ہے اور ٹی وی تو ہے ہی مجسمۂ فساد، اس کے تمام مفاسد سے آنکھیں بند کر کے اُسے جائز کیسے قرار دیا جائے؟ اگر خارجی مفاسد سے بھی قطع نظر کرتے ہوئے یہ فرض کر لیا جائے کہ براہِ راست پیش کیے جانے والے مناظر عکس (یا شبیہ بالعکس) ہیں اور پہلے سے فلمائے گئے مناظر تصویر، تو ہر ٹی وی بین ہر وقت یہ چھان بین کیسے کرے گا کہ اس وقت یہ پروگرام براہِ راست نشر ہو رہا ہے یا اس کی فلم دکھائی جارہی ہے؟۔ (احسن الفتاوی، کتاب الحظر والاباحۃ، ۸/۳۰۱، ط: ایچ ایم سعید)

ناعاقبت اندیشی اور حقائق سے اعراض

ماہنامہ ''وفاق المدارس'' میں ''ٹی وی اور چینل کی تباہ کاریاں اور شریعت اسلام میں ان کا عدمِ جواز'' کے عنوان کے تحت استاذ المحدثین شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب مدظلہ تحریر فرماتے ہیں:

''خلاصہ یہ ہے کہ ڈیجیٹل تصاویر کو ممنوع تصویر کے زمرے سے خارج قرار دینا جیسا کہ بعض ناعاقبت اندیش اور حقائق سے منہ چھپانے والے نام نہاد اُمت مسلمہ کے خیر خواہ کہہ اور کر رہے ہیں، یہ ایک بدیہی اور سامنے موجود حقیقت کا انکار ہرگز قابل التفات نہیں۔ ٹی وی جو منکرات وفواحش کا منبع ہے، اس کو تبلیغ اسلام اور دفاعِ اسلام کے لیے استعمال کرنا ایسا ہی ہے، جیسے کسی ناپاک برتن کو پاکیزہ اور خوش ذائقہ مشروب کے لیے استعمال کیا جائے۔

آج ہم اسلامی تعلیمات پر عمل کے بجائے مغربی تہذیب کے زیر اثر فواحش ومنکرات کی طرف مائل ہو رہے ہیں، عوام اور خود اپنے آپ کو دھوکا دے کر ٹی وی اور چینل کو اسلام کی تبلیغ اور دفاع اسلام کی خاطر استعمال کرنے کے منصوبے بنا رہے ہیں، یاد رکھیے! آپ جو چاہیں کہتے رہیں اور کرتے رہیں، خداوند تعالیٰ کو دھوکا نہیں دے سکتے، اسلام کی تبلیغ اور اس کا دفاع آج ہی کا مسئلہ نہیں ہے، یہ مسئلہ تو چودہ سو سال سے زیادہ زمانے سے ٹی وی اور چینل کے بغیر بڑی کامیابی سے جاری ہے''۔ (اور جاری رہے گا، ان شاء اللہ!)

اللہ تعالیٰ ہمیں صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں اور ہر باطل کو باطل جان کر اس سے دور رہنے کی توفیق نصیب فرمائیں۔ آمین

مولانا عبداللہ ندیم فاروقیؒ کی شہادت

محمد اعجاز مصطفیٰ

۲۱؍شوال ۱۴۳۴ھ مطابق ۲۹؍اگست ۲۰۱۳ء بروز جمعرات کو جامعہ خیرالمدارس ملتان کے فاضل، رحمانیہ مسجد جمشید روڈ کراچی کے امام وخطیب، امامِ ربانی حضرت مولانا حکیم محمد اختر نور اللہ مرقدہٗ کے مسترشد' حضرت مولانا محمد عبداللہ ندیم فاروقی بن شمس الدین کو ظالم اور سفاک قاتلوں نے اس وقت جامِ شہادت پلایا، جب کہ وہ مسجد کے متصل دارالافتاء میں تشریف فرما تھے۔ إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون، إن للّٰہ ماأخذ ولہٗ ماأعطٰی وکل شیء عندہٗ بأجل مسمّٰی۔

مولانا مرحوم کے والدین پاکستان بننے کے بعد مشرقی پنجاب ہندوستان سے ہجرت کر کے کوٹ اَدُّو ضلع مظفرگڑھ تشریف لائے، جہاں ۱۹۵۱ء میں مولانا شہیدؒ کی پیدائش ہوئی، بعد میں وہاں سے نقل مکانی کر کے خانیوال کو اپنا مسکن بنایا۔

آپؒ نے ابتدائی تعلیم پنجاب کے مختلف مدارس سے حاصل کی، اور ۱۹۷۲ء میں جامعہ خیرالمدارس ملتان سے دورہ حدیث پڑھ کر سندِ فراغ حاصل کی۔ دینی تعلیم سے فراغت کے بعد آپؒ نے کراچی کا سفر کیا اور یہاں انجمن اشاعتِ قرآن عظیم کے ادارہ سے وابستہ ہوگئے، اس میں مختلف امور انجام دیتے رہے اور اس کے ساتھ ساتھ جناب نواب عشرت خاں قیصرؒ کے ایماء اور مشورہ سے ان کے زیرِ انتظام کلفٹن کی ایک مسجد میں نمازیں پڑھاتے اور درسِ قرآن دیا کرتے تھے۔ انجمن اشاعت قرآن عظیم میں چند سال کام کرنے کے بعد آپؒ نے وہاں سے استعفاء دے دیا اور کلفٹن کی مسجد سے بھی استعفاء دے کر امامت وخطابت کے لیے رحمانیہ مسجد میں منتقل ہوگئے اور دن میں لٹل فوکس اسکول مسلم آباد میں پڑھاتے تھے۔ ۱۲، ۱۳؍سال اس اسکول میں پڑھانے کے بعد ۱۹۹۸ء میں آپؒ نے وہاں سے بھی استعفاء دے دیا اور پھر مستقل مسجد میں ہی وقت دینے لگے۔

مسجد سے متصل ایک دارالافتاء بھی قائم کیا، جس میں بیٹھ کر شب وروز لوگوں کے مسائل سنتے اور اُنہیں قرآن وسنت کی روشنی میں ان کا حل بتلاتے۔ ہر اتوار کو بعد نمازِ مغرب مجلس ذکر کراتے اور لوگوں کو

اللہ اللہ سکھاتے تھے ۔ اللہ تعالیٰ نے آپؒ کو حرمین سے بھی خاص عقیدت وتعلق ودیعت فرمایا تھا، جس کی بنا پر آپؒ ہر سال عمرہ کی غرض سے اپنے گھر والوں کے ساتھ وہاں تشریف لے جاتے تھے، اس سال بھی آپ نے حج کے لیے درخواست دی تھی، لیکن بعد میں درخواست واپس لی اور طے کیا کہ اگلے سال حج پر جاؤں گا۔

قرآن کریم خاص ادا سے پڑھتے تھے ۔ ساری زندگی تہجد کے معمول کو نبھایا اور تین بجے رات کو اُٹھنے کے بعد صبح تک اپنا وقت ذکر اور تلاوتِ قرآن میں صرف فرماتے تھے اور خاص ادا سے اللہ تعالیٰ سے دعا کیا کرتے تھے کہ یا اللہ! مجھے ارذلِ عمر سے محفوظ فرما اور چلتے پھرتے اس دنیا سے اٹھا لے ۔ آپؒ ہمیشہ حضور ﷺ کے فرمان کے مطابق سفید لباس زیب تن فرماتے تھے ۔ ۴۱ ؍سال تک آپؒ رحمانیہ مسجد سے منسلک رہے اور ہمیشہ مالی معاملات میں محتاط رہے اور پائی پائی کا حساب جوڑ کر رکھتے تھے ۔ مولانا نے ساری زندگی دین کے لیے وقف کر رکھی تھی اور کسی خاص جماعت سے اُنہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی ۔

جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن سے آپ کو خاص محبت اور تعلق تھا، جس کا اظہار اس سے ہوتا تھا کہ آپؒ اکثر اوقات جامعہ اور خاص طور پر ماہنامہ ''بینات'' کے دفتر میں آکر تشریف فرما ہوتے اور حضرت مولانا فضل حق صاحب مدظلہٗ سے ماہنامہ ''بینات'' اور اس کے متعلقہ امور کے بارے میں گفت وشنید ہوتی تھی ۔

کراچی کے علاقہ گلشن معمار میں ایک مدرسہ جامعہ عبداللہ بن مسعودؓ کے نام سے قائم کیا تھا، پیر اور جمعرات کے روز صبح کے وقت وہاں جانے کا معمول تھا ۔ شہادت کے روز اسی مدرسہ میں انتظامی معاملات دیکھنے کے بعد تقریباً پونے بارہ کے قریب رحمانیہ مسجد جمشید روڈ واپس پہنچے، گھر میں آنے کے بعد دوبارہ تازہ وضو کیا اور فرمایا کہ دل چاہتا ہے کہ تازہ وضو کرلوں اور وضو کے بعد دارالافتاء میں آئے، تقریباً بارہ بجے کے قریب یہ حادثہ پیش آیا ۔ دارالافتاء کے دو دروازے تھے، ایک دروازہ مسجد میں اور ایک دروازہ باہر گلی کی طرف کھلتا تھا، سفاک قاتل گلی کی جانب کھلے ہوئے دروازے سے اندر آئے اور قریب سے گولیاں مار کر فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے ۔ سات آٹھ گولیاں لگیں، زخمی حالت میں لیاقت نیشنل ہسپتال لے جایا گیا، اس وقت سانسیں چل رہی تھیں، ہسپتال پہنچنے کے بعد ڈاکٹروں نے شہادت کی تصدیق کر دی ۔

مولانا مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے تین بیٹوں اور چار بیٹیوں سے نوازا تھا ۔ ماشاء اللہ! سب کی شادی اپنی زندگی میں ہی کر دی تھی ۔ اور تینوں بیٹے عالم اور جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے فاضل ہیں ۔

اللہ تعالیٰ مولانا کی شہادت کو قبول فرمائیں اور آپؒ کے پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق سے نوازیں ۔ علماء کرام، طلبہ کرام اور تمام مسلمانوں کے ایمان اور جان ومال کی حفاظت فرمائیں، آمین ۔

زکوٰۃ فنڈ کو کاروبار میں لگانا

ادارہ

محترم جناب مفتی صاحب جامعہ بنوری ٹاؤن کراچی !.......................السلام علیکم

ہمارا ادارہ ایک رفاہی وفلاحی ادارہ ہے، ادارے میں جو زکوٰۃ جمع ہوتی ہے، اس سے بیواؤں اور نادار افراد کو وظائف دیئے جاتے ہیں، غریبوں کی اعانت کی جاتی ہے، علاج ومعالجہ کیا جاتا ہے۔ اور یہ سب کچھ ایک سسٹم کے تحت ہوتا ہے، اور زکوٰۃ کی آمد وخرچ کا مکمل حساب رکھا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہر سال ہمارا آڈٹ ہوتا ہے اور رپورٹ شائع کی جاتی ہے۔ ادارے کے پاس جمع شدہ زکوٰۃ کے متعلق یہ تجویز آئی ہے کہ اُسے کسی محفوظ اور نفع بخش کاروبار میں لگا دیا جائے ، یا پھر اس مقصد کے لیے فنڈ کو اسلامی بینکنگ سسٹم میں مخصوص مدت کے لیے invest کر دیا جائے یا کسی اسلامی بینک سے سرٹیفکٹس خرید لیے جائیں جو بوقتِ ضرورت cash کرائے جاسکتے ہوں اور ملنے والا نفع زکوٰۃ ہی کی مد میں استعمال کیا جائے۔ براہِ کرم رہنمائی فرمادیں کہ کیا ایسا کرنا درست ہے؟ والسلام: محمد عبداللہ

الجواب باسمہٖ تعالیٰ

فلاحی ادارے کے پاس جمع شدہ زکوٰۃ کی رقم کو کسی محفوظ اور نفع بخش کاروبار میں لگانا یا اس مقصد کے لیے کسی اسلامی بینکنگ سسٹم میں مخصوص وغیر مخصوص مدت کے لیے invest کر دینا یا کسی اسلامی بینک سے سرٹیفکٹ خرید لینا اور بوقتِ ضرورت cash کرالینا اور نفع زکوٰۃ کی مد میں استعمال کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔

ا:......زکوٰۃ کی رقم دینے والوں نے مستحقین میں خرچ کرنے کے لیے ادارے کو نمائندہ اور وکیل ومعتمد بنایا ہے، اس کاروبار سے زکوٰۃ دینے والے کے شرعی فریضہ میں تاخیر لازم آتی ہے، حضور ﷺ فوراً تقسیم فرمایا کرتے تھے۔

۲:......کاروبار میں نفع ونقصان دونوں ہوتے ہیں، اگر نقصان ہوتو زکوٰۃ دینے والوں کی زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، اور ادارے پر ضمان لازم آئے گا، یہ شرعی واخلاقی مسائل جنم دے گا۔

۳:...... بیان کردہ صورتیں جائز کاروبار کی ہیں جو شرعاً بے غبار طور پر جائز ہو، اسلام کی طرف منسوب مروجہ بینکوں میں انویسٹمنٹ یا سرٹیفکس خریدنا علماء کے ایک بڑے طبقے کے نزدیک ناجائز ہے، اس معنی کر مسلمانوں کی حلال آمدنی کی جائز زکوٰۃ کو ناجائز کام میں لگا کر آلودہ کرنے کی غلطی بھی لازم آرہی ہے، اس لیے زکوٰۃ فنڈ کو کاروبار میں لگانا شرعی لحاظ سے جائز نہیں ہے۔

الجواب صحیح	کتبہ
ابوبکر سعید الرحمٰن	مفتی رفیق احمد بالاکوٹی

جامعہ علوم اسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کراچی

نقد و نظر

ادارہ

ہفت اولیاء (منظوم)

جناب انجم نیازی صاحب۔صفحات:۲۸۸۔ قیمت: درج نہیں۔ناشر: دارالامین لاہور۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ صفدریہ، ماڈل ٹاؤن بی، بہاول پور۔موبائل نمبر:0307-5687800۔

جناب انجم نیازی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے اس بات کی خوب توفیق اور سعادت نصیب فرمائی کہ آپ نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے فضائل اور مناقب میں آٹھ گراں قدر اور عظیم کتب بہت ہی قلیل مدت میں منظوم انداز میں عشاقِ صحابہ کرامؓ کے سامنے پیش فرمادیں، جن کے نام یہ ہیں: پہلا صحابیؓ، مراد مصطفیؐ، ذوالنورینؓ، فاتح خیبر شیر خدا علی المرتضیٰؓ، فاتح قبرص سیدنا امیر معاویہؓ، یارانِ رسول، حسنین کریمینؓ، صدیقۂ کائنات ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ، میری امی جان حفصہؓ اور اب زیر تبصرہ کتاب صحابہ کرامؓ کے سات دیوانوں، پروانوں اور ترجمانوں کا روح پرور ایمان افروز تذکرہ ''ہفت اولیاء'' کے نام سے منظوم کیا ہے، اور ہر ایک کے شروع میں ان کے چیدہ چیدہ مختصر حالات بھی نثر میں قید تحریر میں لائے ہیں۔ان ہفت اولیاء سے مراد: شیخ العرب والعجم مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، امام اہل السنۃ والجماعۃ علامہ مولانا عبدالشکور لکھنویؒ، حافظ الحدیث حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستیؒ، قائد اہل سنت وکیل صحابہؓ حضرت مولانا قاضی مظہر حسینؒ، وکیل صحابہؓ حضرت مولانا قاضی عبداللطیف جہلمیؒ، مناظر اسلام حضرت مولانا علامہ عبدالستار تونسوی نوراللہ مراقدہم اور محقق اہل سنت حضرت مولانا محمد نافع صاحب مدظلہ ہیں۔

ان بزرگوں کے منظوم انداز میں تذکرہ پر مشتمل یہ غالباً پہلی کتاب ہے۔امید ہے ان علماء کرام اور بزرگانِ دین سے محبت رکھنے والے اس کتاب کی خوب قدر افزائی فرمائیں گے۔

اے میرے لخت جگر

ابوعثمان ماسٹر عبدالرؤف صاحب۔صفحات:۲۹۶۔ قیمت: درج نہیں۔ناشر: الرشید پبلی کیشنز مرادپور، پی او (ڈاکخانہ) قریشی والا، لودھراں۔

زیرِ تبصرہ کتاب ''اے میرے لختِ جگر'' مؤلف نے اخبارات ورسائل کے سمندر میں غوطہ زن ہوکر بہت ہی قیمتی ہیرے اور جواہرات نکال کر اسکول وکالج اور دینی مدارس کے طلبہ کے لیے ایک خوبصورت مالا تیار کی ہے، اس کتاب کو مؤلف نے ۱۶/ابواب میں تقسیم کیا ہے، جن کے نام یہ ہیں:

باب نمبر:۱......رب کا شکر ادا کر بھائی!۔ باب نمبر:۲......والدین کی قدر کیجئے!۔ باب نمبر:۳...... ہے زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا۔ باب نمبر:۴......مقامِ عبرت۔ باب نمبر:۵...... وقت کی قدر وقیمت۔ باب نمبر:۶......کتاب بہترین ساتھی ہے، کتاب دوست بنئے۔ باب نمبر:۷......مطالعہ کی اہمیت۔ باب نمبر:۸......اگر آپ مصنف، ادیب یا صحافی بننا چاہتے ہیں۔ باب نمبر:۹......حفظانِ صحت۔ باب نمبر:۱۰......کچھ کرلو نوجوانو! اُٹھتی جوانیاں ہیں۔ باب نمبر:۱۱......نو/۹ صحت مند عادات۔ باب نمبر:۱۲......میرا پیغام محبت ہے!۔ باب نمبر:۱۳......علم کی اہمیت۔ باب نمبر:۱۴......آگے بڑھئے!۔ باب نمبر:۱۵......نصیحت ہی نصیحت۔ باب نمبر:۱۶......کرن کرن خوشبو۔

اللہ تعالیٰ مؤلف کی اس تالیف اور حسن انتخاب کو قبول فرمائے اور آخرت میں قارئین اور مؤلف کی نجات کا ذریعہ بنائے۔

تاریخ ادبِ عربی (دورِ جاہلیت سے دورِ حاضر تک)

پروفیسر ڈاکٹر سید وقار احمد رضوی۔ صفحات: ۵۲۰۔ عام قیمت: ۳۰۰ روپے، رعایتی قیمت: ۱۵۰ روپے۔ ناشر: قدیمی کتب خانہ آرام باغ کراچی۔

عربی ادب کی پوری تاریخ، عربی زبان کا تہذیبی پس منظر، عرب کے حصے، عرب کی قسمیں، شعراء کے نام، اسلوبِ شاعری، شعراء کے طبقے، عربی شاعری کی تدوین، عربی ادب منثور وادب منظوم، حضور اکرم ﷺ سے لے کر ہمارے زمانہ تک عربی ادب پر گزرے حالات اور شعراء، زیرِ تبصرہ کتاب میں ان سب کا ذکر قاری کو پڑھنے کے لیے ملے گا۔ بہرحال کتاب پر بہت محنت کی گئی ہے اور شائقینِ علم کے لیے عربی ادب کی تاریخ میں یہ انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے۔ امید ہے اہل علم اس کتاب کا ضرور مطالعہ کریں گے۔

نفحۃ الاصول

مولانا فراز احمد۔ صفحات: ۴۳۰۔ قیمت: درج نہیں۔ ناشر: مکتبہ حبیبیہ رشیدیہ، اردو بازار لاہور۔

مولانا فراز احمد جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے فاضل اور اقرأ روضۃ الاطفال ٹرسٹ کے زیرِ تحت شعبہ اقرأ معہد الحافظات میں استاذ ومدرس ہیں۔ انہوں نے دورانِ تدریس اصولِ فقہ کو نئے انداز میں پڑھانے اور بیان کرنے کی طرح ڈالی ہے، اور وہ اصولِ فقہ سے متعلق کتب کے مطالعہ کے بعد اس مکمل بحث کا خلاصہ اور نچوڑ آسان اور عام فہم انداز میں سمجھانا اور

پڑھانا ہے۔ مولانا موصوف اس میں خوب خوب کامیاب ہوئے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد اصولِ فقہ سے متعلق تمام کتب مثلاً: اصول الشاشی، نورالانوار، حسامی اور التوضیح والتلویح وغیرہ کے بنیادی مضامین کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ ''نفحۃ الاصول'' میں اصطلاحات، مسائل، جزئیات اور ان کی مثالیں کتابی انداز کی بجائے بیانی انداز میں بہت عمدگی سے ترتیب دی گئی ہیں۔

کتاب کا مختصر تعارف ٹائٹل پر یوں کرایا گیا ہے:

> ''اصول فقہ کے تمام بنیادی مسائل کا مرتب اور آسان حل۔ تاریخی و علمی نکات پر مشتمل طویل مقدمہ۔ اصولِ فقہ، اصول الشاشی، تمام مباحث کی دلنشین اور آسان تشریح۔ اختلافِ امت، اجتہاد اور تقلید جیسے موضوعات پر ضروری اور مختصر بحث''۔

امید ہے اصولِ فقہ میں دلچسپی رکھنے والے علماء اور طلبہ اس کتاب کا ایک بار ضرور مطالعہ کریں گے۔